BANGALORE CITY UNIVERSITY

Coure Title : B.Sc (UG)

LANGUAGE URDU

State Education Policy (SEP) 2024-25 and onwards

First Semester

Coure Content: Afsana, nazmein , Grammar , Drama

Coure Credits : 3 Total Contact Hours : 4/week

Summative Assessment Marks=80

Farmative Assessment Marks= 20

UNIT : 1

افسانے

۱) آدھی سیڑھیاں — طارق چھتاری

۲) بچھو پھوپھی — عصمت چغتائی

۳) ایک جھوٹی/ سچی کہانی — سلام بن رزاق

۴) جھوٹ — یوسف عارفی

UNIT : 2

نظمیں

۱) بازیافت — محمود ایاز

۲) شکوہ، جوابِ شکوہ (پروڈی) — دلاور فگار

۳) پیارا وطن ہمارا — سلیمان خطیب

۴) چپ نہ رہو — مخدوم محی الدین

UNIT : 3

گرامر

۱) اسم اور اس کی قسمیں

۲) ضمیر اور کی قسمیں

UNIT : 4

ڈراما

ایک تھا راجہ — کمال احمد

طارق چھتاری

آدھی سیڑھیاں

سعیدہ بیگم اپنے کمرے سے نکل کر دہرے دالان سے ہوتے ہوئے احمد کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

''اٹھ گئے بیٹے؟''

''جی امی جان۔۔۔''

احمد آنکھیں ملتا ہوا بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔

''آفتابے میں گرم پانی رکھ دیا ہے، جاؤ منہ دھولو۔''

احمد نے منہ دھولیا تو سعیدہ بیگم ناشتہ لے کر اس کے کمرے میں آ گئیں۔

''اب شادی میں صرف ایک مہینہ باقی ہے اور تم نے روپیوں کا ابھی تک کوئی انتظام نہیں کیا۔ مہمانوں کو دعوت نامے بھی پہنچنے ہیں۔ ایک مہینہ پہلے سے تو مہمان داری جڑنا ہی چاہیے۔''

احمد روغنی روٹی کا نوالہ چباتے ہوئے بولا۔

''امی جان، اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ اب کسی کے پاس اتنا وقت کہاں ہے جو مہینوں پہلے سے شرکت کرے۔ جنہیں بلانا ہوگا ہفتہ بھر پہلے دعوت نامے بھیج دیں گے۔ خاص خاص رشتے داروں کو تو بلانا ہی ہے۔ بھیڑ جمع کرنے سے کیا فائدہ۔''

سعیدہ بیگم نے دیکھا کہ رکابی میں خاگینہ اسی طرح رکھا ہوا ہے اور وہ روکھے لقمے نگل رہا ہے۔

''ٹھیک ہے بیٹے جیسی تمہاری مرضی۔''

احمد نے ناشتے کے بعد سلفچی میں ہاتھ دھوئے اور صدر دروازے سے نکلتا ہوا لالا دیوی سرن کی بیٹھک کی جانب مڑ گیا۔ لالا چبوترے پر ہی دھوپ میں پلنگ ڈالے بیٹھے تھے۔

''آؤ احمد میاں۔۔۔ کیسے تکلیف کی؟''

احمد چارپائی کے برابر رکھے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

''بہت دنوں سے آپ کے درشن نہیں ہوئے تھے۔ پڑھائی لکھائی کے چکر میں علی گڑھ سے آنا ہی نہیں ہوتا۔ سوچا اب آیا ہوں تو آپ سے مل آؤں اور پھر نیوتا جو دینا تھا۔''

''کاہے کا نیوتا احمد میاں۔۔۔''

لالا جی کا ہاتھ پیٹ پر رینگنے لگا۔

''وہ بات یہ ہے کہ میں۔۔۔میرا مطلب ہے امی جان نے رشتہ پکا کر دیا ہے۔ایک مہینے بعد کی تاریخ طے ہوگئی ہے۔''

''مگر رشتہ تو میاں اپنے سامنے ہی پکا کر گئے تھے۔روشن نگر والے میاں کی بیٹی کے ساتھ۔''

''وہ بات یہ ہے کہ۔۔۔''

احمد سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

''اچھا تو وہاں سے رشتہ ٹوٹ گیا۔۔۔''

لالا دیوی سرن نے ٹوٹنے پر اس طرح زور دیا جیسے یہ تو ٹوٹنا ہی تھا۔

''ویسے اب کہاں ہوا ہے رشتہ؟''

احمد کا جی چاہا کہ کوئی جواب نہ دے مگر اس نے الفاظ ڈھکیلے۔

''علی گڑھ میں ہی ایک لڑکی ہے۔''

''تمہارے سنگ پڑھتی ہوگی۔''

''جی۔''

مجرم کی طرح احمد نے گردن جھکالی۔

''احمد میاں جب سے تم علی گڑھ گئے ہو،تمہارا بستی سے کوئی ناتا ہی نہیں رہا۔کتنی پڑھائی اور ہے؟''

''بس ریسرچ۔۔۔یعنی کچھ لکھنا ہے بس ایک کتاب۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر یہاں۔۔۔تم نے کھیتی باڑی بھی نوکروں کے اوپر چھوڑ رکھی ہے اور اب تو شادی بھی علی گڑھ میں ہی۔۔۔''

وہ سر نیچا کیے خاموش بیٹھا تھا۔

''بیاہ کی تیاری تو سب ہے نا؟''

''ہاں تیاری تو ہو رہی ہے۔''

احمد نے آہستہ سے کہا۔لالا دیوی سرن نے گھاگ نظروں سے اسے دیکھا اور سب کچھ سمجھ گئے۔

''اچھا تم کل صبح نو بجے آجانا۔''

صبح اٹھ کر جب وہ ڈیوڑھی کے صدر دروازے سے باہر نکلا تو دیکھا کہ دو بچے دھوپ میں کنچے کھیل رہے ہیں۔ احمد اونچے چبوترے پر کھڑا چھوٹی چھوٹی کانچ کی ان گولیوں کو دیکھتا رہا جنہیں بچے انگلیوں سے ادھر ادھر لڑھکا رہے تھے۔ ہری گولیوں والا بچہ جیت رہا تھا۔ بچے نے جب سے ہری گولیاں نکال کر اطمینان سے زمین پر پھیلا دیں اور جیتی ہوئی لال گولیوں کو چاک کی جیب میں رکھ لیا۔ احمد نے سامنے دیکھا، دور تالاب کے اس پار اس کے اپنے ہرے ہرے کھیت لہلہا رہے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور جب کھولیں تو محسوس ہوا کہ صدیاں بیت گئی ہیں۔ اب بازی پلٹ گئی تھی۔ زمین پر بکھری ہری گولیاں غائب تھیں اور لال گولیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ سورج کی کرنیں زمین پر اتر آئی تھیں اور کانچ کی لال گولیوں پر اس طرح پڑ رہی تھیں کہ اس کے کھیت اب سرخ نظر آ رہے تھے۔ احمد نے گھڑی دیکھی، نو بجنے ہی والے تھے۔ وہ لالا دیوی سرن کی گدی پر پہنچا۔ دیکھا کہ لالا اپنا لال بہی کھاتا لیے کچھ لوگوں کے بیچ بیٹھے حساب کتاب میں مشغول ہیں۔

''آداب عرض لالا جی۔۔۔''

''آداب عرض احمد میاں۔ کیسے آنا ہوا؟''

''جی۔۔۔؟''

احمد بوکھلا گیا۔

''ارے ہاں۔۔۔ آؤ آؤ بیٹھو۔ اچھا کندن لال جی کل آنا کام ہو جائیگا اور بھیا نند نا تم بھی اپنے گاؤں جاؤ فکر مت کر اور تم یہ لو۔۔۔''

سب لوگ لالا جی کو نمستے کرتے ہوئے بیٹھک سے اٹھ کر چلے گئے اور جو بیٹھے رہ گئے وہ جیسے آدمی نہ ہوں سامان کی گٹھریاں رکھی ہوں۔۔۔ لالا دیوی سرن نے احمد کی طرف کھسکتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

''تمھیں روپیوں کی ضرورت ہے نا؟''

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ دراصل لالا دیوی سرن کا سوال ہی احمد کا جواب تھا۔

''دیکھو کنور صاحب، سرکار نے کچھ ایسے قانون بنا دیے ہیں کہ بغیر کوئی چیز رکھے بیان پر روپیہ دیتے ڈر لگتا ہے۔ اب تو بیاج کا کام ختم ہوتا ہی لگے ہے۔ پیٹ پالنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑیگا۔ سوچ رہا ہوں بھینسیں پال کر دودھ کا کام شروع کر دوں۔''

لالا دیوی سرن بولتے رہے۔

''شادی کے بعد ماتا جی کو تو اپنے ساتھ ہی لے جاؤ گے، ڈیوڑھی خالی ہو جائیگی، زنان خانہ تو ٹوٹ ہی گیا ہے بس ڈیوڑھی کا حصہ بچا ہے، اگر اسے بیچ دو تو میں اس میں بھینسیں پالنے کا بندوبست کر لوں۔ میرا بھی کام نکل جائیگا اور تمہاری شادی بھی۔۔۔''

احمد کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کچھ حیرت سے، کچھ قصداً تا کہ آنسو خشک ہو جائیں اور ٹپکنے نہ پائیں۔ رنگ برنگے دائرے بننے مٹنے لگے اور نظروں میں بچپن کی دھندلی تصویریں ابھر آئیں۔

'ابا حضور دالان میں بیٹھے فرشی حقہ پی رہے ہیں۔ دھوئیں میں شامل خمیرے کی فضا معطر ہے۔ وہ امی جان کے ہاتھ کی کڑھی سچے گوٹے کی کناری والی گول ریشمی ٹوپی پہنے آنگن میں کھیل رہا ہے۔ دھوپ میں جہازی پلنگوں پر ابا حضور کی اچکنیں، گرم شیروانیاں اور امی جان کے کمخواب اور پوتھ کے غرارے پھیلے ہوئے ہیں۔ اسے پشمینے کی شالوں اور کشمیری نمدوں میں بسی کافور کی مہک بہت اچھی لگتی ہے۔ وہ ابا حضور کی آنکھ بچا کر کپڑوں سے کھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ ریا ضو گود میں اٹھانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ بری طرح مچلنے لگتا ہے۔ پائیں باغ میں رحیما بیلے اور ہار سنگار کے پھول چن رہا ہے۔ امی جان ہاتھ میں آب پاش لیے شہتوت کے پیڑ میں پانی لگا رہی ہیں۔ یہ پیڑ دادا جان نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ اس کے شہتوت بہت میٹھے ہیں۔ جب بھی اترتے ہیں تو امی جان غفور خاں کے ہاتھ روشن نگر ضرور بھیجتی ہیں۔'

''کیا سور ہے ہو احمد میاں؟''

لالا دیوی سرن نے اسے چونکا دیا۔

''لالا جی، میں ڈیوڑھی تو نہیں بیچ سکتا۔''

احمد نے دوٹوک جواب دیا اور سوچنے لگا کہ ایک تو پہلے ہی بہت کچھ بک چکا ہے۔ ڈیوڑھی کے علاوہ بمبے کے سہارے والی اسی پچاسی بیگھے زمین ہی تو بچی ہے۔ اگر ڈیوڑھی بھی بک گئی تو بستی میں جو کچھ عزت ہے وہ بھی خاک میں مل جائیگی۔ پھر لالا سے مخاطب ہو کر بولا۔

''آپ اگر سود پر روپیہ نہیں دے سکتے تو دس پانچ بیگھے زمین خرید لیجیے۔''

''نہیں احمد۔۔۔''

میاں شاید دل میں کہا ہو مگر زبان سے صرف احمد ہی نکلا اور احمد کے بعد تھوڑا وقفہ دیا پھر بولے۔

''میرے پرکھوں نے بھی کھیتی نہیں کی۔ میں زمین کا کیا کروں گا اور وہ بھی صرف دس پانچ بیگھے۔ اب اتنی سی زمین کے لیے نوکر رکھوں، جوارا بناؤں اور پھر بیل باندھنے کو ایک گھیر۔۔۔ ایک دو بیگھے زمین تو اسی میں گھر جائیگی، پھر بچی ہی کتنی۔۔۔''

تھوڑی دیر دونوں خاموش رہے پھر لالا دیوی سرن کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

''ہاں اگر سو ڈیڑھ سو بیگھے زمین ہو تو اس میں کچھ روپیہ لگایا بھی جائے۔ مجھے زمین کا بیوپار تو کرنا نہیں ہے کہ تم سے اونے پونے داموں میں خرید کر کسی اور کو بیچ دوں۔''

''لالا جی امی جان نے آپ ہی کے بھروسے تاریخ طے کی تھی''

''تو پھر ساری زمین بیچ دو۔ میں خرید لوں گا۔ تمہیں کون سی کھیتی باڑی کرنی ہے۔ پڑھ لکھ کر تو نوکری ہی کرو گے''۔

لالا دیوی سرن، احمد کا چہرہ پڑھنے لگے۔ پھر خاموش بیٹھے لوگوں کی طرف دیکھا اور الماری سے پوتھی نکال کر پٹ اس طرح بند کیے جیسے احمد کو باہر نکال کر دروازہ بند کر لیا ہو۔ احمد نے محسوس کیا کہ وہ سامان کی گٹھری بن گیا ہے۔

اس نے پہلو بدلا تو لالا نے اس پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور بولے۔

''یا پھر کسی کسان سے بات کر لو۔ کوئی نہ کوئی مل ہی جائیگا''

احمد کہاں گھر گھر جا کر زمین بیچنے کی بات کرتا گھومتا۔ اس نے دو چار لوگوں سے بات کی بھی، مگر ان کے لیے اتنی جلدی روپیوں کا انتظام کرنا مشکل تھا۔ جن کے پاس روپیے تھے وہ اس کی ضرورت کا فائدہ اٹھا کر کوڑیوں کے دام خریدنا چاہتے تھے۔ شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے اور ابھی تک پاندان کی چھالیوں بھر کا انتظام بھی نہ ہو پایا تھا۔ بدنامی کے خوف سے تاریخ بھی نہیں بڑھائی جا سکتی تھی۔

مغرب کی اذان ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ بمبے والے کھیت اندھیرے میں ڈوب گئے تھے، مگر وہ ڈیوڑھی کی بالائی منزل پر کھڑا اپنے کھیتوں کو گھورے جا رہا تھا۔ زینے سے اتر کر جب اس نے سعیدہ بیگم کے کمرے میں جھانکا تو وہ دعا کے بعد جانماز لپیٹ رہی تھیں۔ جب وہ پلنگ پر تسبیح لے کر بیٹھیں تو احمد بھی کمرے میں داخل ہو گیا۔ سعیدہ بیگم نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

''وہ ایسا ہے امی جان۔۔۔''

''کیا ہے بیٹے؟''

''کچھ نہیں، آج سردی بہت ہے۔''

''کیا بتو کی اماں نے تمہارے پلنگ کے نیچے بھوبھل کا کونڈا نہیں رکھا؟''

انھوں نے کچھ اس انداز سے باہر جھانکا جیسے بتو کی اماں کو پکارنے والی ہوں۔

''بھوبھل تو رکھ دی ہے مگر سوچا کچھ دیر آپ کے پاس ہی بیٹھ لوں۔''

''ہاں بیٹے۔۔۔ تمہارا یہاں دل بھی تو نہیں لگتا ہوگا۔ بچپن میں ہی تو شہر چلے گئے تھے۔ کبھی ایک دو روز کے لیے آتے ہو، دل لگے بھی کیسے۔''

''نہیں امی جان یہ بات نہیں ہے، دراصل آپ سے ایک بات کرنی تھی۔''

''ہاں کہو۔۔۔''

سعیدہ بیگم نے تسبیح تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

''بات تو کوئی خاص نہیں ہے۔بس یوں ہی اپنے فیوچر۔۔۔میرا مطلب ہے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پڑھائی سال ڈیڑھ سال میں ختم ہو جائیگی۔آج کل نوکریاں تو ملتی نہیں ہیں اور پڑھائی لکھائی کے بعد یہاں آ کر کھیتی باڑی کرنا۔۔۔کھیتی باڑی بھی کوئی کیا کرے،حکومت نے سیلنگ کا ایسا چکر چلایا ہے کہ پتا نہیں یہ زمین بھی رہے یا نہیں۔میں نے سوچا ہے۔۔۔''

احمد کہتے کہتے رک گیا۔

''کیا سوچا ہے؟''

سعیدہ بیگم نے پوچھا۔

ہمیں اب کھیتی کے بھروسے نہیں رہنا چاہیے۔آمدنی کا کوئی اور ذریعہ۔۔۔''

''بات تو ٹھیک ہے،مگر اور کیا ہوسکتا ہے؟''

سعیدہ بیگم غور سے سننے کے لیے تھوڑا آگے کھسک آئیں۔

''آج کل شہروں میں مکانوں کے کرائے بہت ہیں،اگر کچھ مکان بنوا دیے جائیں تو ماہانہ آمدنی خاصی ہو جائیگی اور پھر رہنے کو بھی ایک مکان ہو جائیگا،کرائے کے مکان میں تو۔۔۔آپ کا بھی یہاں اکیلے دل گھبراتا ہوگا،وہیں ساتھ رہیں گے۔آپ کا دل بھی لگا رہیگا۔''

احمد ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا تو سعیدہ بیگم نے چھت کی طرف دیکھا۔ایک جنگلی کبوتر شہتیر کے کنڈے میں جھول رہا تھا۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ اپنے پر پھلانے لگا اور پھر کنڈے کے دائرے سے نکل کر پر پھڑ پھڑاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔نیچے فرش پر گرنے ہی والا تھا کہ سنبھلا اور روشن دان کی طرف اڑا۔روشن دان کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا،کبوتر تیزی سے نکلا اور باہر تاریکی میں گم ہوگیا۔سعیدہ بیگم نے احمد کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

''لیکن بیٹے،اس کے لیے پیسا بھی تو چاہیے۔''

''امی جان نوکروں کی کھیتی میں بچتا ہی کیا ہے اور اس وقت لالا دیوی سرن ہماری زمین کے دام بھی اچھے لگا رہے ہیں۔آئندہ معلوم نہیں کیسا موقع ہو،اگر آپ کی اجازت ہو۔۔۔''

سعیدہ بیگم کی آنکھ سے آنسو گرا اور لحاف کی روئی میں جذب ہوگیا۔وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولیں۔

''اس بچی کھچی زمین کو کیوں بیچتے ہو۔تمہارا یہاں سے بالکل اکھڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ایسے کبھی کبھار آ بھی جاتے ہو۔پڑی رہنے دو اسے اپنے ابا حضور کی نشانی سمجھ کر۔''

''لیکن امی جان،شادی کے لیے روپیوں کا انتظام بھی تو نہیں ہو پایا ہے۔لالا نے سود پر دینے سے صاف انکار کر دیا ہے۔میں نے چاہا دس پانچ بیگھے زمین بیچ دوں،مگر کوئی گاہک نہیں ملا۔لالا تیار ہیں مگر کہتے ہیں،ساری زمین بیچو تو خرید بھی لوں۔۔۔''

''کوئی اور صورت نکل سکتی ہو تو اچھا ہے بیٹے۔''

''بس ایک ہی طریقہ ہے کہ چار پانچ معمولی سے جوڑے ہو جائیں اور ابا حضور کے جو بٹن ہیں۔۔۔''

سعیدہ بیگم نے جلدی سے احمد کی بات کاٹ دی۔

''نہیں احمد،ہمیں برات لے کر دوسرے کی دہلیز پر جانا ہے۔اپنی نہیں تو اپنے ابا حضور کی عزت کا تو خیال کرو،اگر شادی دھوم دھام سے نہیں ہوئی تو بستی والے کیا کہیں گے۔''

''مگر اب روپیوں کا تو کہیں سے انتظام نہیں ہو سکتا۔''

''کچھ بھی ہو بیٹے،زمین بیچنا ٹھیک نہیں ہے۔''

سعیدہ بیگم نے لیٹتے ہوئے کہا۔

احمد اپنے کمرے میں جلتی ہوئی لالٹین کی لَو کبھی تیز کرتا تو کبھی کم۔جب لو اتنی کم ہو جاتی کہ لالٹین کے بجھ جانے کا گمان ہونے لگتا تو وہ ہڑبڑا کر اس کی لو تیز کر دیتا کہ چمنی چٹخ جانے کا خوف اس کے جسم میں تیر جاتا۔چمنی اتنی سیاہ ہو چکی تھی کہ شیشے کی قید سے باہر نکلنا اب روشنی کے بس میں نہیں تھا۔

''آنکھیں بند کر لینا اور سو جانا ہی بہتر ہے۔''اس نے سوچا۔

وہ بستر پر لیٹ تو گیا مگر نیند لالا دیوی سرن کی چوکھٹ پر کھڑی رہی اور اس کی آنکھیں رات بھر چھت کی کڑیاں گنتی رہیں۔

سعیدہ بیگم کو کچھ بتائے بغیر سب طے ہو گیا۔لالا دیوی سرن نے آدھی رقم دے کر کاغذ کرا لیا اور باقی روپیے بیع نامے کے وقت دینے کا وعدہ کر لیا۔احمد نے جب سعیدہ بیگم کے ہاتھ میں روپیے لا کر دیے تو ان کے ہاتھ کانپ گئے۔احمد کے چہرے کا جائزہ لیا،پھر بولیں۔

''کیا تم نے زمین بیچ دی۔۔۔؟''

''اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔''

''تو کیا یہ ڈیوڑھی بھی بیچ دو گے؟''

سعیدہ بیگم کی بوڑھی نظریں ڈیوڑھی کی دیواروں پر رینگنے لگیں۔

''نہیں امی جان، عید بقرعید تو ہم یہیں کریں گے۔''

احمد نے اپنی دانست میں سعیدہ بیگم کو مطمئن کر دیا۔

شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ہار، بندے، بالیاں، جھمکے، بازو بند، نتھ، جھومر، چوڑی اور کنگن، سبھی زیورات خریدے گئے۔ ریشم کے کسی کپڑے پر زری تو کسی پر زردوزی کا کام شروع ہو گیا۔ سینے پرونے میں ماہر محلے بھر کی لڑکیاں اپنی انگلیوں کے کرتب دکھانے لگیں۔ تلے دانیاں نکل آئیں، دالان میں کہیں سلمے تو کہیں ستارے اور کہیں کلابتو بکھرے نظر آنے لگے۔ مسالوں کی کُٹائی کے لیے ہاون دستے نکل آئے۔ تانبے کے نقشیں خاص دان، گلاب پاش، پاندان، حسن دان، بادیے اور طبق قلعی گر کی دکان پر پہنچ گئے اور تاکید کر دی گئی کہ قلعی کا سب سے قیمتی کشتہ استعمال کیا جائے۔ دیواروں، دروں، طاقوں اور محرابوں کی مرمت ہوئی اور پوری ڈیوڑھی کی پُتائی کے بعد شامیانے اور قناتیں لگا کر چھت میں قندیلیں لٹکا دی گئیں اور مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے جگہ جگہ تخت بچھا دیے گئے۔ سعیدہ بیگم کی خواہش کے مطابق احمد میاں کی برات میں بستی کے ہندو، مسلمان سبھی نے شرکت کی۔ صبا دلہن بن کر آئی تو خوشی میں رات بھر آتش بازی چھوٹتی رہی۔ ولیمے کی دعوت میں قرب و جوار کے گاؤں والوں کو بھی بلایا گیا اور پھر ڈیوڑھی شہر کے ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں منتقل ہو گئی۔ بڑا سا غسل خانہ سمٹ کر باتھ روم بن گیا۔ قد مچوں کا رنگ سفید پڑ گیا۔ چولھے سے گیس نکلنے لگی اور کمروں کی چھتیں اتنی نیچی کھسک آئیں کہ سعیدہ بیگم کا دم گھٹنے لگا۔ اس دن سعیدہ بیگم کو سخت کوفت ہوئی جب ان کا پیتل کا کٹورا انگریزی نسل کے پالتو کتے نے چاٹ لیا اور مانجنے کے لیے ان کے گھر میں تو کیا پڑوس میں بھی راکھ نہ مل پائی۔ سردیاں گزر گئیں۔ نہ سقاوہ، نہ تیتڑا، نہ آتش دان، نہ انگیٹھی، سعیدہ بیگم کے ہاتھ کوئلے کی آنچ کو ترستے ہی رہے۔ ہاں دن میں کئی کئی بار چائے پینے کو ملتی رہی۔

''تم لوگ کتنی چائے پیتے ہو؟ چائے پیتے میری تو زبان موٹی ہو گئی ہے۔''

آخر ایک دن سعیدہ بیگم نے ٹوک ہی دیا۔

''اور یہ جو تم نے نوکر رکھا ہے بلا کا سست، دوپہر کا کھانا شام ہونے کو آتی ہے تب جا کے پکا پاتا ہے۔ کچھ کہو تو بڑبڑانا شروع۔ کیا یہاں نوکر کم ملتے ہیں؟

''یہی بہت مشکل سے ملا ہے۔''

احمد نے کہا اور سعیدہ بیگم کی نظروں میں ریاضو، رحیما اور غفور خاں کے سعادت مند چہرے گھومنے لگے۔

''مجھ سے تمہارا یہ چولھا جلانا نہیں آتا۔ ورنہ میں ہی پکا دیا کرتی اور یہ جو سیٹی والا دیگچہ ہے، اس میں کھانا بھلے ہی جلدی پکتا ہو، مگر ہوتا بالکل بے مزہ ہے۔ میں نے تو ایک وقت بھی پیٹ بھر نہیں کھایا۔''

احمد مسکرانے لگا، سنبھل کر بیٹھا اور سمجھانے کے انداز میں بولا۔

''امی جان اس میں پکا ہوا کھانا بہت مفید ہوتا ہے۔ چونکہ اس کی بھاپ نکلنے نہیں پاتی، اس لیے سارے وٹامن، مطلب ساری طاقت اندر رہتی ہے۔''

''تو بیٹے تمہارے خیال میں کھوئے میں تو بالکل طاقت نہیں ہوتی ہوگی۔''

الغرض احمد کا کوئی جواب سعیدہ بیگم کو مطمئن نہ کر سکا۔ سرہانے رکھی پان کی پٹاری اٹھائی، پان لگایا، منہ میں رکھا، تھوڑی دیر چبایا اور پھر پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھا، وہاں پیکدان نہیں تھا۔ وہ اٹھیں اور برآمدے میں لگے واش بیسن کی طرف چل دیں۔

دونوں وقت مل رہے ہیں۔ روشنی پوری طرح ختم نہیں ہوئی اور اندھیرا پاؤں پسارنے لگا۔ سعیدہ بیگم چھوٹے سے لان کے ایک کونے میں بید کے اسٹول پر تنہا بیٹھی گھنٹوں سے گزرے زمانے کی مالا گوندھ رہی ہیں۔ کیاری میں منی پلانٹ کی بیل باؤنڈری کے سہارے اوپر چڑھ رہی ہے۔ کیاری سوکھ چکی ہے۔ احمد اور صبا کو فرصت ہی کہاں ہے اور سعیدہ بیگم پانی لگائیں تو کس پودے میں؟ مولسری ہے، نہ چنبیلی اور نہ شہتوت۔ کچھ کانٹے دار پودے ہیں تو کچھ کو گملے میں قید کر کے بونا بنا دیا گیا ہے۔ کسی میں پانی زیادہ لگتا ہے، کسی میں کم اور کسی میں بالکل نہیں۔ اب اس عمر میں اجنبی پودوں سے کہاں تک مانوس ہوا جائے۔ سعیدہ بیگم نے ایک نگاہ چھوٹے سے فلیٹ کی دیواروں پر ڈالی۔ نگاہوں میں ڈیوڑھی کا صدر دروازہ گھوم گیا۔ ان کی پالکی اندر داخل ہو رہی ہے۔ انھوں نے سچے کام کے بھاری دوپٹے کے گھونگھٹ سے جھانکا۔ محلے بھر کی کنواری لڑکیوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ وہ اسی طرح مہینوں تک دلہن بنی بیٹھی رہی تھیں۔ اماں بیگم نے سال بھر تک کسی کام سے ہاتھ نہیں لگانے دیا تھا۔ جب انھوں نے پہلی بار کھیر کی ہنڈیا میں ڈوئی چلائی تو اس پر نیاز دے کر اماں بیگم نے اسے پورے محلے میں تقسیم کیا تھا۔ پریشر کوکر کی سیٹی نے انھیں چونکا دیا۔ احمد اور صبا کی شادی کو کچھ ہی ہفتے گزرے تھے اور صبا کچن میں کھانا پکا رہی تھی۔ وہ روزانہ سبزی گوشت پھل سبھی کچھ خود ہی خرید کر لاتی ہے۔ انھیں محسوس ہوا کہ صبا کا وجود ان کے چاروں طرف ہیولے کی شکل میں گردش کر رہا ہے اور ان کا اپنا وجود مٹتا جا رہا ہے۔ صبا کہاں جا رہی ہے؟ کون آ رہا ہے؟ کیوں آ رہا ہے؟ کس کے لیے چائے بن رہی ہے؟ کمرے میں احمد کے دوستوں کے درمیان صبا کن باتوں پر قہقہہ لگا رہی ہے؟ سعیدہ بیگم کو کسی بات کا علم نہیں تھا۔ آخر کار ایک دن انھوں نے احمد کو بلایا اور سمجھانے لگیں۔

''بیٹے یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ ہمارے خاندان میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بہو بازار۔۔۔''

اس پر وہ ہنس دیا اور سعیدہ بیگم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ خود کو بہت چھوٹا محسوس کرنے لگیں۔ یہ گھر، یہ ماحول، اپنا بیٹا اپنی بہو سب کچھ پرایا سا لگنے لگا اور وہ اپنے بیٹے بہو سے بہت دور ہوتی چلی گئیں۔

ایک دن احمد نے صبا سے پوچھا۔

''تم سے کوئی بات ہوئی ہے امی جان کی؟ کچھ خاموش رہتی ہیں، بالکل گم سم سی۔''

''نہیں تو، مجھ سے تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے ایک دن پوچھا بھی تھا، پہلے چپ رہیں، پھر کچھ اس طرح جواب دیا کہ اس کے بعد کوئی بات پوچھنے کی میری ہمت نہیں ہوئی۔''

احمد سوچنے لگا۔

''معلوم نہیں امی جان کو کیا ہو گیا ہے۔ بالکل غیروں کی طرح برتاؤ کرتی ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ یہ وہی۔۔۔''

وقت گزرتا رہا۔ ریسرچ مکمل ہونے کے بعد اسے عارضی نوکری مل گئی۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو اس نے سوچا کہ بیع نامہ ان ہی چھٹیوں میں کر دیا جائے تاکہ باقی روپیہ مل سکے۔ لہٰذا سب کا قصبے جانے کا پروگرام بن گیا۔ سعیدہ بیگم نے ڈیوڑھی میں پہنچ کر سب سے پہلے شہتوت کے پیڑ میں پانی لگایا۔ بتو کی اماں کو خبر ہوئی تو وہ آ گئیں۔ پوری ڈیوڑھی دھول مٹی سے اٹی پڑی تھی۔

باغیچہ سوکھ کر بنجر ہو گیا تھا۔ دیواروں اور چھتوں پر مکڑی کے جالے لگے ہوئے تھے۔ بتو کی اماں محلے کے دو چار بچوں کو بلا لائیں۔ بدلو سقے کو خبر ہوئی تو مشک بھر کر لے آیا۔ کوڑا کرکٹ ایک طرف کر کے صحن میں چھڑکاؤ کر دیا گیا۔ بتو کی اماں سعیدہ بیگم کے کمرے کی صفائی میں جٹ پڑیں اور سعیدہ بیگم نے اپنی بہو کے کمرے کو جھاڑ پونچھ کر ٹھیک کر دیا۔ احمد بازار سے ضرورت بھر جنس لے آیا۔ سعیدہ بیگم نے پوری ڈیوڑھی کو سر پر اٹھا لیا۔

''بتو کی اماں جلدی سے چاول بین لو۔ بہو کے لیے مزعفر بنانا ہے۔''

''کیا بیگم صاحبہ؟''

''ارے سب کچھ بھول گئیں۔ زردہ۔ اور کیا؟ اور دیکھو کباب کا قیمہ اچھی طرح پیسنا۔ کمبخت ہریا ابھی تک کھویا لے کر نہیں آیا۔ آج کل کے بچے اتنے کام چور ہیں کہ ذرا سے کام میں جان نکلتی ہے اور یہ نتھن تو کسی دین کا نہیں ہے، میوے منگائے تو سیلے ہوئے لے آیا۔ اب رحیما اور غفور خاں جیسے آدمی کہاں سے آئیں۔''

پھر انھیں کچھ یاد آیا اور چونک کر بولیں۔

''ارے ہاں، چائے کا پانی رکھنا تو میں بھول ہی گئی۔ بہو کو چائے پینے کی عادت ہے، بیچاری نے صبح سے نہیں پی۔''

سعیدہ بیگم بہو کے کمرے میں گئیں تو وہاں صبا کو محلے کی لڑکیاں گھیرے بیٹھی تھیں۔

''یہ کیا۔۔۔ اب تم گھر جاؤ۔ تھوڑی دیر تو بہو کو آرام کرنے دو۔ کل آ جانا۔ بہو کے ہاتھ سے کھیر پلیگی۔ سمجھیں۔۔۔''

انھوں نے سب لڑکیوں کو رخصت کر کے بہو کو مسہری پر لٹایا اور کمرے کی دونوں کھڑکیاں کھول دیں۔

احمد نے لالا دیوی سرن کے نام بیع نامہ کر کے بقایا وصول کر لیا۔ دیوڑھی کی تجوری اپنے پرانے انداز میں کھلنے اور بند ہونے لگی، شہتوت کے مرجھائے پتے سرسبز ہو گئے کہ اچانک سعیدہ بیگم کو معلوم ہوا، چھٹیاں گزر گئی ہیں۔ انھیں لگا کہ ابھی تو ایک لمحہ بھی نہیں گزرا اور۔۔۔

''امی جان کل جانا ہے۔ آپ کی تیاری تو سب ہے نا؟ صبح ذرا جلدی چل دیں گے۔۔۔''

احمد یہ کہتا ہوا اپنی مچھر دانی میں جا کر سو گیا۔

رات آدھی سے زیادہ ہو چکی تھی۔ احمد نے کروٹ لی۔ ایک آہٹ سی ہوئی، آہٹ ڈیوڑھی کے دالان میں ہوئی تھی۔ آنکھیں کھولیں تو دیکھا سعیدہ بیگم ہاتھ میں تسبیح لیے ادھر سے ادھر ٹہل رہی ہیں۔

''امی جان ابھی تک نہیں سوئیں۔۔۔؟''

اس نے سوچا۔ اٹھنا چاہا مگر اٹھا نہیں، بس چپ چاپ لیٹا انھیں دیکھتا رہا۔ دالان کی محراب میں لالٹین لٹک رہی تھی جو ہوا کے جھونکے سے ہلنے لگی تھی۔ سعیدہ بیگم کا سایہ کبھی طویل ہو کر دبے پاؤں ڈیوڑھی کی دیواروں پر چڑھنے لگتا اور کبھی سمٹ کر ان کے قدموں میں دم توڑ دیتا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے صحن کو پار کر کے باغیچے میں لگے شہتوت کے قریب پہنچیں، پانی سے بھری بالٹی اٹھائی اور شہتوت کے پیڑ میں انڈیل دی۔ وہاں سے لوٹ کر صدر دروازے تک آئیں۔ نقش ونگار والے برسوں پرانے موٹے کواڑ چھوئے، پھر دالان میں لٹکی لالٹین اتار کر زینے کی طرف مڑیں اور سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ مگر آدھی سیڑھیوں تک ہی پہنچی ہوں گی کہ جانے کیا سوچ کر واپس اتر آئیں۔۔۔!

عصمت چغتائی

بچھو پھوپی

جب پہلی بار میں نے انہیں دیکھا تو وہ رحمان بھائی کے پہلے منزلے کی کھڑکی میں بیٹھی لمبی لمبی گالیاں اور کوسنے دے رہی تھیں۔ یہ کھڑکی ہمارے صحن میں کھلتی تھی اور قانوناً اسے بند رکھا جاتا تھا۔ کیوں کہ پردے والی بی بیوں کا سامنا ہونے کا ڈر تھا۔ رحمان بھائی رنڈیوں کے جمعدار تھے، کوئی شادی بیاہ، ختنہ، بسم اللہ کی رسم ہوتی، رحمان بھائی اونے پونے ان رنڈیوں کو بلا دیتے اور غریب کے گھر میں بھی وحید جان، مشتری بائی اور انوری کہروا ناچ جاتیں۔

مگر محلے ٹولے کی لڑکیاں بالیاں ان کی نظر میں اپنی سگی ماں بہنیں تھیں۔ ان کے چھوٹے بھائی بندو اور گیندا آئے دن تاک جھانک کے سلسلہ میں سر پھٹول کیا کرتے تھے، ویسے رحمان بھائی محلے کی نظروں میں کوئی اچھی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کی زندگی ہی میں اپنی سالی سے جوڑ توڑ کر لیا تھا۔ اس یتیم سی سالی کا سوائے اس بہن کے اور کوئی مرا جیتا نہ تھا۔ بہن کے ہاں پڑی تھی۔ اس کے بچے پالتی تھی۔ بس دودھ پلانے کی کسر تھی۔ باقی سارا گو موت وہی کرتی تھی۔

اور پھر کسی نک چڑھی نے اسے بہن کے بچے کے منہ میں ایک دن چھاتی دیتے دیکھ لیا۔ بھانڈا پھوٹ گیا اور پتہ چلا کہ بچوں میں آدھے بالکل ''خالہ'' کی صورت پہ ہیں۔ گھر میں رحمان کی دلہن چاہے بہن کی درگت بناتی ہوں پر کبھی پنچوں میں اقرار نہ کیا۔ یہی کہا کرتی تھیں۔ ''جو کنواری کو کہے گا، اس کے دیدے گھٹنوں کے آگے آئے گا۔'' ہاں بر کی تلاش میں ہر دم سوکھا کرتی تھیں، پر اس کیڑے بھرے کباب کو بر کہاں جُج جڑتا؟ ایک آنکھ میں یہ بڑی کوڑی سی پھلی تھی۔ پیر بھی ایک ذرا چھوٹا تھا۔ کولہا دبا کر چلتی تھی۔

سارے محلے سے ایک عجیب طرح کا بائیکاٹ ہو چکا تھا۔ لوگ رحمان بھائی سے کام پڑتا تو دھونس جما کر کہہ دیتے، محلے میں رہنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ یہی کیا کم عنایت تھی۔ رحمان بھائی اسی کو اپنی عزت افزائی سمجھتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ رحمان بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر طول طویل گالیاں دیا کرتی تھی۔ کیوں کہ باقی محلے کے لوگ ابا سے دبتے تھے مجسٹریٹ سے کون بیر مول لے۔

اس دن پہلی دفعہ مجھے معلوم ہوا کہ ہماری اکلوتی سگی پھوپی بادشاہی خانم ہیں اور یہ لمبی لمبی گالیاں ہمارے خاندان کو دی جا رہی تھیں۔

اماں کا چہرہ فق تھا اور وہ اندر کمرے میں سہمی بیٹھی تھیں، جیسے بچھو پھوپی کی آواز ان پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑے گی۔ چھٹے چھ ماہے اسی طرح بادشاہی خانم رحمان بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر ہنکارتیں، ابا میاں ان سے زرا سی آڑ لے کر مزے سے آرام کرسی پر دراز اخبار پڑھتے رہتے اور موقع محل پر کسی لڑکے بالے کے ذریعے کوئی ایسی بات جواب میں کہہ دیتے کہ پھوپی بادشاہی پھر شتابیاں چھوڑنے لگتیں۔ ہم لوگ سب کھیل کود، پڑھنا لکھنا چھوڑ کر صحن میں گچھا بنا کر کھڑے ہو جاتے اور مڑ مڑ اپنی پیاری پھوپی کے کوسنے سنا کرتے۔ جس کھڑکی میں وہ بیٹھتی تھیں وہ ان کے طول طویل جسم سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ ابا میاں سے اتنی ہم شکل تھیں جیسے وہی مونچھیں اتار کر ڈوپٹہ اوڑھ کر بیٹھ گیے ہوں۔ اور باوجود کوسنے اور گالیاں سننے کے ہم لوگ بڑے اطمینان سے انہیں تکا کرتے تھے۔

ساڑھے پانچ فٹ کا قد، چار انگل چوڑی کلائی، شیر سا کلا، سفید بگلا بال، بڑا سا دہانہ، بڑے بڑے دانت، بھاری سی تھوڑی اور آواز تو ماشاءاللہ، ابا میاں سے ایک سر نیچی ہی ہوگی۔

پھوپی بادشاہی ہمیشہ سفید کپڑے پہنا کرتیں تھیں۔ جس دن پھوپا مسعود علی نے مہترانی کے سنگ کلیلیں کرنی شروع کیں، پھوپی نے بٹے سے ساری چوڑیاں چھنا چھن توڑ ڈالیں۔ رنگا ڈوپٹہ اتار دیا اور اس دن سے وہ انہیں ''مرحوم'' یا ''مرنے والا'' کہا کرتی تھیں۔ مہترانی کو چھونے کے بعد انہوں نے وہ ہاتھ پھر اپنے جسم کو نہ لگنے دیئے۔

یہ سانحہ جوانی میں ہوا تھا اور جب سے ''رنڈاپا'' جھیل رہی تھیں۔ ہمارے پھوپا ہماری اماں کے چچا بھی تھے۔ ویسے تو نہ جانے کیا گھپلا تھا۔ میرے ابا میری اماں کے چچا لگتے تھے۔ اور شادی سے پہلے جب وہ چھوٹی سی تھیں تو میرے ابا کو دیکھ کر ان کا پیشاب نکل جاتا تھا۔ اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان کی منگنی اسی بھیانک دیو سے ہونے والی ہے۔ تو انہوں نے اپنی دادی یعنی ابا کی پھوپی کی پٹاری سے افیون چرا کر کھالی تھی۔ افیون زیادہ نہیں تھی اور کچھ دن لوٹ پوٹ کر اچھی ہوگئیں۔ ان دنوں ابا علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔ ان کی بیماری کی خبر سن کر امتحان چھوڑ کر بھاگے۔ بڑی مشکل سے ہمارے نانا جو ابا کے پھوپی زاد بھائی بھی تھے اور بزرگ دوست بھی، انہوں نے سمجھا بجھا کر واپس امتحان دینے بھیجا تھا۔ جتنی دیر وہ رہے، بھوکے پیاسے ٹہلتے رہے۔ ادھ کھلی آنکھوں سے میری اماں نے ان کا چوڑا چکلا سایہ پردے کے پیچھے بے قراری سے تڑپتے دیکھا۔

''امراؤ بھائی! اگر انہیں کچھ ہوگیا ... تو...'' دیو کی آواز لرز رہی تھی۔ نانا میاں خوب ہنسے۔

''نہیں برادر، خاطر جمع رکھو۔ کچھ نہ ہوگا۔''

اس وقت میری منی سی معصوم ماں ایک دم عورت بن گئی تھی۔ اس کے دل سے ایک دم دیوزاد انسان کا خوف نکل گیا تھا۔ جبھی تو میری پھوپی بادشاہی کہتی تھی میری اماں جادوگرنی ہے اور اس کا تو میرے بھائی سے شادی سے پہلے تعلق ہو کر پیٹ گرا تھا۔ میری اماں اپنے جوان بچوں کے سامنے جب یہ گالیاں سنتیں تو ایسی بسور بسور کر روتیں کہ ہمیں ان کی مار فراموش ہو جاتی اور پیار آنے لگتا۔ مگر یہ گالیاں سن کر

ابا کی گمبھیر آنکھوں میں پریاں ناچنے لگتیں۔ وہ بڑے پیار سے ننھے بھائی کے ذریعے کہلواتے۔

''کیوں پھوپی، آج کیا کھایا ہے؟''

''تیری میا کا کلیجہ۔'' اس بے تکے جواب سے پھوپی جل کر مرندا ہو جاتیں، ابا پھر جواب دلواتے۔

''ارے پھوپی، جب ہی منہ میں بواسیر ہوگئی ہے جلاب لو جلاب!''

وہ میرے نوجوان بھائی کی مچلتی لاش پر کوؤں، چیلوں کی دعوت دینے لگتیں۔ ان کی دلہن کو جو نہ جانے بیچاری اس وقت کہاں بیٹھی اپنے خیالی دولہا کے عشق میں لرز رہی ہوگی، رنڈاپے کی دعائیں دیتیں۔ اور میری اماں کانوں میں انگلیاں دے کر بد بداتیں۔

''جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو۔''

پھر ابا اکساتے اور ننھے بھائی پوچھتے۔

''پھوپی بادشہی، مہترانی پھوپی کا مزاج تو اچھا ہے؟'' اور ہمیں ڈر لگتا کہ کہیں پھوپی کھڑکی میں سے پھاند نہ پڑیں۔

''ارے جا سنپولیے، میرے منہ نہ لگ، نہیں تو جوتی سے منہ مسل دوں گی۔ یہ بڈھا اندر بیٹھا کیا لونڈوں کو سکھا رہا ہے۔ مغل بچہ ہے تو سامنے آ کر بات کرے۔''

''رحمان بھائی اے رحمان بھائی، اس بورانی کتیا کو سنکھیا کیوں نہیں کھلاتے'' ابا کے سکھانے پر ننھے بھائی ڈرتے ہوئے بولتے۔ حالانکہ انہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیوں کہ سب جانتے تھے کہ آواز ان کی ہے، مگر الفاظ اباں میاں کے ہیں۔ لہٰذا گناہ ننھے بھائی کی جان پر نہیں۔ مگر پھر بھی بالکل ابا کی شکل کی پھوپی کی شان میں کچھ کہتے ہوئے انہیں پسینے آ جاتے تھے۔

کتنا زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ہمارے ددھیال اور ننھیال والوں میں۔ ننھیال حکیموں گلی میں تھی اور ددھیال گاڑی بانوں کٹہڑے میں۔ ننھیال والے سلیم چشتی کے خاندان سے تھے۔ جنہیں مغل بادشاہ نے مرشد کا مرتبہ دے کر نجات کا راستہ پہچانا۔ ہندوستان میں اسے بسے عرصہ گزر چکا تھا۔ رنگتیں سنولا چکی تھیں نقوش نرم پڑ چکے تھے۔ مزاج ٹھنڈے ہو گیے تھے۔

ددھیال والے باہر سے سب سے آخری کھیپ میں آنے والوں میں سے تھے۔ ذہنی طور پر ابھی تک گھوڑوں پر سوار منزلیں مار رہے تھے۔ خون میں لاوا دہک رہا تھا۔ کھڑے کھڑے تلوار جیسے نقوش، لال فرنگیوں جیسے منہ، گریلوں جیسی قد و قامت، شیروں جیسی گرجدار آوازیں۔ شہتیر جیسے ہاتھ پاؤں۔

اور ننھیال والے، نازک ہاتھ پیروں والے شاعرانہ طبیعت کے دھیمی آواز میں بولنے چالنے کے عادی۔ زیادہ تر حکیم، عالم اور مولوی تھے۔ جبھی محلے کا نام حکیموں کی گلی پڑ گیا تھا۔ کچھ کاروبار میں بھی حصہ لینے لگے تھے، شال باف، زردوز اور عطار وغیرہ بن چکے تھے۔ حالانکہ میری ددھیال والے ایسے لوگوں کو کنجڑے قصائی ہی کہا کرتے تھے۔ کیوں کہ وہ خود زیادہ تر فوج میں تھے۔ ویسے مار دھاڑ کا شوق

ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ کشتی، پہلوانی، تیراکی میں نام پیدا کرنا، پنجہ لڑانا، تلوار اور پٹے کے ہاتھوں دکھانا اور چوسر پچیسی کو جو میری ننھیال کے مرغوب ترین کھیل تھے ہیجڑوں کے کھیل سمجھتے۔

کہتے ہیں جب آتش فشاں پہاڑ پھٹتا ہے تو لاوا وادی کی گود میں اتر آتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرے ددھیال والے ننھیال والوں کی طرف خود بخود کھینچ کر آ گیے۔ یہ میل کب اور کس نے شروع کیا، سب شجرے میں لکھا ہے، مگر مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ میرے دادا ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ دادیاں بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی مگر ایک چھوٹی سی بہن بن بیاہی تھی۔ نہ جانے کیوں کر وہ شیخوں میں بیاہ دی گئی۔ شاید میری اماں کے دادا نے میرے دادا پر کوئی جادو کر دیا تھا کہ انہوں نے اپنی بہن بقول پھوپی بادشاہی کنجڑوں قصائیوں میں دے دی۔ اپنے ''مرحوم'' شوہر کو گالیاں دیتے وقت وہ ہمیشہ اپنے باپ کو قبر میں چین نہ ملنے کی بد دعائیں دیا کرتیں۔ جنہوں نے چغتائی خاندان کی مٹی پلید کر دی۔

میری پھوپی کے تین بھائی تھے۔ میرے تایا، میرے ابا میاں اور میرے چچا۔ دو ان سے بڑے تھے اور چچا سب سے چھوٹے تھے۔ تین بھائیوں کی ایک لاڈلی بہن، ہمیشہ کی نخریلی اور تنک مزاج تھیں۔ وہ ہمیشہ تینوں پر رعب جماتیں اور لاڈ کرواتیں۔ بالکل لونڈوں کی طرح پلیں، شیر سواری، تیر اندازی اور تلوار چلانے کی بھی خاصی مشق تھی۔ ویسے تو پھیل پھال کر ڈھیر معلوم ہوتی تھیں۔ مگر پہلوانوں کی طرح سینہ تان کر چلتی تھیں۔ سینہ تھا بھی چار عورتوں جتنا۔

ابا مذاق میں اماں کو چھیڑا کرتے۔

''بیگم بادشاہی سے کشتی لڑو گی؟''

''اوئی توبہ میری! عالم فاضل باپ کی بیٹی'' میری اماں کان پر ہاتھ دھر کر کہتیں، مگر وہ ننھے بھائی سے فوراً پھوپی کو چیلنج بھجواتے۔

''پھوپی ہماری اماں سے کشتی لڑو گی؟''

''ہاں، ہاں بلا اپنی اماں کو۔ آ جائے خم ٹھوک کر۔ ارے الونہ بنا دوں تو مرزا کریم بیگ کی اولاد نہیں۔ باپ کا نطفہ ہے تو بلا۔ بلا ملا زادی کو...'' اور میری اماں اپنا لکھنؤ کا بڑے پائنچوں کا پاجامہ سمیٹ کر کونے میں دبک جاتیں۔

''پھوپی بادشاہی، دادا میاں گنوار تھے نا؟ بڑے نانا جان انہیں آمد نامہ پڑھایا کرتے تھے۔'' ہمارے پرنانا کے دادا جان نے کبھی دادا کو کچھ پڑھا دیا ہوگا'' ابا میاں چھیڑنے کو بات توڑ موڑ کر کہلواتے۔

''ارے وہ استنجے کا ڈھیلا کیا میرے باوا کو پڑھاتا۔ مجاور کہیں کا، ہمارے ٹکڑوں پر پلتا تھا۔'' یہ سلیم چشتی اور اکبر بادشاہ کے رشتے سے حساب لگایا جاتا۔ ہم لوگ یعنی چغتائی اکبر بادشاہ کے خاندان سے تھے۔ جنہوں نے میری ننھیال کے سلیم چشتی کو پیر و مرشد کہا تھا۔ مگر پھوپی کہتیں۔ ''خاک، پیر و مرشد کی دم! مجاور تھے مجاور۔''

تین بھائی تھے مگر تینوں سے لڑائی ہو چکی تھی۔ اور وہ غصہ ہوتیں تو تینوں کی دھجیاں بکھیر دیتیں۔ بڑے بھائی بڑے اللہ والے تھے، انہیں حقارت سے فقیر اور بھیک منگا کہتیں۔ ہمارے ابا گورنمنٹ سروس میں تھے۔ انہیں غدار اور انگیزوں کا غلام کہتیں، کیوں کہ مغل شاہی انگریزوں نے ختم کر ڈالی، ورنہ آج۔ ''مرحوم'' پتلی دال کے کھانے والے جولاہے یعنی میرے پھوپا کے بجائے وہ لال قلعے میں زیب النساء کی طرح عرق گلاب میں غسل فرما کر کسی ملک کے شہنشاہ کی ملکہ بنی بیٹھی ہوتیں۔ تیسرے یعنی بڑے چچا دس نمر کے بدمعاشوں میں سے تھے اور سپاہی ڈرتا ڈرتا مجسٹریٹ بھائی کے گھر ان کی حاضری لینے آیا کرتا تھا۔ انہوں نے کئی قتل کیے تھے، ڈاکے ڈالے تھے۔ شراب اور رنڈی بازی میں اپنی مثال آپ تھے۔ وہ انہیں ڈاکو کہا کرتی تھیں جو ان کے کیریئر کو دیکھتے ہوئے قطعی پھسپھسا لفظ تھا۔

مگر جب وہ اپنے ''مرحوم'' شوہر سے غصہ ہوتیں تو کہا کرتیں۔ ''منہ جلے۔ نگوڑی ناہٹی نہیں ہوں۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ ان کو خبر ہو گئی تو دنیا کا نہ رہے گا۔ اور کچھ نہیں۔ اگر چھوٹا سن لے تو پل بھر میں انتڑیاں نکال کے ہاتھ میں تھما دے۔ ڈاکو ہے ڈاکو ... اس سے بچ گیا تو منجھلا مجسٹریٹ تجھے جیل کی سزا دے گا۔ ساری عمر چکیاں پسوائے گا اور اس سے بچ گیا تو بڑا جو اللہ والا ہے۔ تیری عاقبت خاک میں ملا دے گا۔ دیکھ مغل بچی ہوں، تیری اماں کی طرح شیخانی فتانی نہیں۔'' مگر میرے پھوپا اچھی طرح جانتے تھے کہ تینوں بھائی ان پر رحم کھاتے ہیں اور وہ بیٹھے مسکراتے رہتے ہیں۔ وہی میٹھی میٹھی زہریلی مسکراہٹ جس کے ذریعے سے میرے ننھیال والے ددھیال والوں کو برسوں سے جلا رہے ہیں۔

ہر عید بقر عید کو میرے ابا میاں بیٹوں کو لے کر عیدگاہ سے سیدھے پھوپی اماں کے ہاں کوسنے اور گالیاں سننے جایا کرتے، وہ فوراً پردہ کر لیتیں اور کوٹھڑی میں سے میری جادوگرنی ماں اور ڈاکو ماموں کو کوسنے لگتیں۔ نوکر کو بلا کر سویاں بجھواتیں۔ مگر یہ کہتیں ''پڑوسن نے بھیجی ہیں۔''

''ان میں زہر تو نہیں ملا ہوا ہے؟'' ابا چھیڑنے کو کہتے اور پھر ساری ننھیال کے چیتھڑے بکھیرے جاتے۔ سویاں کھا کر عیدی دیتے جو وہ فوراً زمین پر پھینک دیتیں کہ ''اپنے سالوں کو دو وہی تمہاری روٹیوں پر پلے ہیں۔'' اور ابا چپ چاپ چلے آتے اور وہ جانتے تھے کہ پھوپی بادشاہی وہ روپے گھنٹوں آنکھوں سے لگا کر روتی رہیں گی۔ بھتیجوں کو وہ آڑ میں بلا کر عیدی دیتیں۔

''حرامزادو اگر اماں ابا کو بتلایا تو بوٹیاں کاٹ کر کتوں کو کھلا دوں گی۔'' اماں ابا کو معلوم تھا کہ لڑکوں کو کتنی عیدی ملی۔ اگر کسی عید پر کسی وجہ سے ابا میاں نہ جا پاتے تو پیغام پر پیغام آتے ''نصرت خانم بیوہ ہو گئیں، چلو اچھا ہوا۔ میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا'' برے برے پیغام شام تک آتے ہی رہتے اور پھر وہ خود رحمان بھائی کے کوٹھے پر سے گالیاں برسانے آ جاتیں۔

ایک دن عید کی سویاں کھاتے کھاتے کچھ گرمی سے جی مالش کرنے لگا۔ ابا میاں کو الٹی ہو گئی۔

''لو بادشاہی خانم، کہا سنا معاف کرنا، ہم تو چلے۔'' ابا میاں نے کراہ کر آواز بنائی اور پھوپی لشتم پشتم پردہ پھینک چھاتی کوٹتی نکل

آئیں۔ابا کو شرارت سے ہنستا دیکھا الٹے پاؤں کوستی لوٹ گئیں۔

''تم آ گئیں بادشاہی تو ملک الموت بھی گھبرا کر بھاگ گیے۔ ورنہ ہم تو آج ختم ہی ہو جاتے''۔ابا نے کہا۔ نہ پوچھیے پھوپی نے کتنے وزنی کوسنے دیئے۔انہیں خطرے سے باہر دیکھ کر بولیں۔

''اللہ نے چاہا بجلی گرے گی۔ نالی میں گر کر دم توڑو گے۔کوئی میت کو کاندھا دینے والا نہ بچے گا'' ابا چڑانے کو انہیں دو روپے بجھوا دیتے۔

''بھئی ہماری خاندانی ڈومنیاں گالیاں دیدیں تو انہیں بیل تو ملنی ہی چاہیئے۔'' اور پھوپی بوکھلاہٹ میں کہہ جاتیں۔

''بیل دے اپنی اماں بہنیا کو۔'' اور پھر فوراً اپنا منہ پیٹنے لگتیں خود ہی کہتیں۔''اے بادشاہی بندی، تیرے منہ کو کالک لگے۔اپنی میت آپ پیٹ رہی ہے۔'' پھوپی کو اصل میں بھائی سے ہی بیر تھا۔بس ان کے نام پر آگ لگ جاتی، ویسے کہیں ابا کے بغیر اماں نظر آ جاتیں تو گلے لگا کر پیار کرتیں۔ پیار سے ''نچھو نچھو'' کہتیں۔''بچے تو اچھے ہیں۔'' وہ بالکل بھول جاتیں کہ یہ بچے اسی بدذات بھائی کے ہیں جسے وہ ازل سے ابد تک کوستی رہیں گی۔اماں ان کی بھتیجی بھی تھیں۔بھئی کس قدر گھپلا تھا میری ددھیال ننھیال میں۔ایک رشتے سے میں اپنی اماں کی بہن بھی لگتی تھی۔اس طرح میرے ابا میرے دولہا بھائی بھی ہوتے تھے۔میری ددھیا کو ننھیال والوں نے کیا کیا غم نہ دیئے۔غضب تو جب ہوا جب میری پھوپی کی بیٹی مسرت خانم ظفر ماموں کو دل دے بیٹھی۔

ہوا یہ کہ میری اماں کی دادی یعنی ابا کی پھوپی جب لب دم ہوئیں تو دونوں طرف کے لوگ تیمارداری کو پہنچے۔میرے ماموں بھی اپنی دادی کو دیکھنے گیے۔مسرت خانم بھی اپنی اماں کے ساتھ ان کی پھوپی دیکھنے آئیں۔

بادشاہی پھوپی کو کچھ ڈر، خوف تو تھا نہیں۔وہ جانتی تھیں کہ میرے ننھیال والوں کی طرف سے انہوں نے اپنی اولاد کے دل میں اطمینان بخش حد تک نفرت بھر دی ہے اور پندرہ برس کی مسرت خانم کا بھی سن ہی کیا تھا۔اماں کے کولہے سے لگ کر سوتی تھیں۔دودھ پیتی ہی تو انہیں لگتی تھیں۔

پھر جب میرے ماموں نے اپنی کرنجی شربت بھری آنکھوں سے مسرت جہاں کے لچک دار سراپے کو دیکھا تو وہیں کی وہیں جم کر رہ گئیں۔

دن بھر بڑے بوڑھے تیمارداری کر کے تھک کر سو جاتے تو یہ فرمانبردار بچے سرہانے بیٹھے مریضہ پر کم ایک دوسرے پر زیادہ نگاہ رکھتے۔جب مسرت جہاں برف میں تر کپڑا بڑی بی کے ماتھے پر بدلنے کو ہاتھ بڑھاتیں تو ظفر ماموں کا ہاتھ وہاں پہلے سے موجود ہوتا۔

دوسرے دن بڑی بی نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔لرزتی کانپتی گاؤ تکیے کے سہارے اٹھ بیٹھیں، اٹھتے ہی سارے خاندان کے ذمہ دار لوگوں کو طلب کیا۔جب سب جمع ہو گیے تو حکم ہوا۔''قاضی کو بلواؤ۔''

لوگ پریشان کہ بڑھیا قاضی کو کیوں بلا رہی ہے، کیا آخری وقت سہاگ رچائے گی، کس کو دم مارنے کی ہمت تھی۔

''دونوں کا نکاح پڑھاؤ۔'' لوگ چکرائے کن دونوں کا۔ مگر ادھر مسرت جہاں پٹ سے بے ہوش ہو کر گریں ادھر ظفر ماموں بوکھلا کر باہر چلے۔ چور پکڑے گیے۔ نکاح ہو گیا، بادشاہی پھوپی سناٹے میں رہ گئیں۔

حالانکہ کوئی خطرناک بات نہ ہوئی تھی، دونوں نے صرف ہاتھ پکڑے تھے۔ مگر بڑی بی کے لیے بس یہی حد تھی۔

اور پھر جو بادشاہی پھوپی کو دورہ پڑا ہے تو بس گھوڑے اور تلوار کے بغیر انہوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ کھڑے کھڑے بیٹی داماد کو نکال دیا۔ مجبوراً ابا میاں دولہا دولہن کو اپنے گھر لے آئے۔ اماں تو چاندسی بھابی کو دیکھ کر نہال ہو گئیں، بڑی دھوم دھام سے ولیمہ کیا۔

بادشاہی پھوپی نے اس دن سے پھوپی کا منہ نہیں دیکھا۔ بھائی سے پردہ کر لیا۔ میاں سے پہلے ہی ناچاقی تھی۔ دنیا سے منہ پھیر لیا۔ اور ایک زہر تھا کہ ان کے دل و دماغ پر چڑھتا ہی گیا۔ زندگی سانپ کے پھن کی طرح ڈسنے لگی۔

''بڑھیا نے پوتے کے لیے میری بچی کو پھنسانے کے لیے مکر گانٹھا تھا۔''

وہ برابر یہی کہے جاتیں، کیوں کہ واقعی وہ اس کے بعد بیس سال تک اور جئیں۔ کون جانے ٹھیک ہی کہتی ہوں پھوپی۔

مرتے دم تک بہن بھائی میں میل نہ ہوا۔ جب ابا میاں پر فالج کا چوتھا حملہ ہوا اور بالکل ہی وقت آ گیا تو انہوں نے پھوپی بادشاہی کو کہلا بھیجا۔

''بادشاہی خانم، ہمارا آخری وقت ہے۔ دل کا ارمان پورا کرنا ہو تو آ جاؤ۔''

نہ جانے اس پیغام میں کیا تیر چھپے تھے۔ بھیا نے پھینکے اور بہنیا کے دل میں ترازو ہو گیے۔ ہلہلاتی، چھاتی کوٹتی، سفید پہاڑ کی طرح بھونچال لاتی ہوئی بادشاہی خانم اس ڈیوڑھی پر اتریں، جہاں اب تک انہوں نے قدم نہیں رکھا تھا۔

''لو بادشاہی، تمہاری دعا پوری ہو رہی ہے۔'' ابا میاں تکلیف میں بھی مسکرا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں اب بھی جوان تھیں۔

پھوپی بادشاہی باوجود بالوں کے وہی منی سی بچھو لگ رہی تھیں جو بچپن میں بھائیوں سے مچل کر بات منوا لیا کرتی تھیں۔ ان کی شیر جیسی خرانٹ آنکھیں ایک میمنے کی معصوم آنکھوں کی طرح سہمی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے آنسو ان کے سنگ مرمر کی چٹان جیسے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

''ہمیں کو سوبچھوبی'' ابا نے پیار سے کہا۔ میری اماں نے سسکتے ہوئے بادشاہی خانم سے کوسنے کی بھیک مانگی۔

یا اللہ ... یا اللہ ... انہوں نے گرجنا چاہا۔ مگر کانپ کر رہ گئیں۔'' یا ... یا اللہ ... میری عمر میرے بھیا کو دیدے ... یا مولا ... اپنے رسول کا صدقہ ...''

وہ اس بچے کی طرح جھنجھلا کر رو پڑیں۔ جسے سبق یاد نہ ہو۔

سب کے منہ فق ہو گیے ۔اماں کے پیروں کا دم نکل گیا۔یا خدا آج بچھو پھوپی کے منہ سے بھائی کے لیے ایک کوسنا نہ نکلا۔

صرف ابا میاں مسکرا رہے تھے۔جیسے ان کے کوسنے سن کر مسکرا دیا کرتے تھے۔

سچ ہے،بہن کے کوسنے بھائی کو نہیں لگتے۔وہ ماں کے دودھ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔

سلام بن رزاق

ایک جھوٹی/ سچی کہانی

میرے بیٹے نے حسب معمول اس رات بھی کہانی کی فرمائش کی۔ میں کافی تھکا ہوا تھا۔ تس پر ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ ہوئی خبروں نے دل و دماغ کو اور بھی پژمردہ کر دیا۔ لگتا تھا پوری دنیا بارود کے ڈھیر پر بیٹھی ہے۔ ایک ذرا سا ماچس دکھانے کی دیر ہے، بس۔ کیا انسان دورِ وحشت کی طرف لوٹ رہا ہے؟ دل بے چین اور دماغ پراگندہ تھا۔ میں نے بیٹے کو پچکارتے ہوئے کہا۔

''آج نہیں بیٹا! آج پاپا بہت تھک گئے ہیں، کل سنائیں گے ہم تمہیں ایک اچھی کہانی۔''

''نہیں، ہم تو آج ہی سنیں گے۔'' اس نے ضد کی۔

''اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔'' میں نے پھر سمجھایا۔

''بس ایک چھوٹی سی کہانی.....ایک دم اتی سی۔'' اس نے انگلی کے پور پر انگوٹھا رکھتے ہوئے اتی سی، کی صراحت کی۔

اس کی اس معصوم ادا پر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے تھک ہار کر کہا۔ ''ٹھیک ہے، ہم کہانی سنائیں گے، مگر تم بیچ میں کوئی سوال نہیں پوچھو گے؟''

''نہیں پوچھوں گا۔''

''ہم تمہیں آج وہ کہانی سناتے ہیں جو تمہارے دادا جان نے ہمیں سنائی تھی۔''

''آہا.....'' اس نے خوش ہوتے ہوئے نعرہ لگایا۔

''پرانے زمانے کی بات ہے.....'' میں نے کہانی شروع کی۔

''کتنی پرانی؟ وہ بیچ میں بول پڑا۔

''اوں ہوں.....میں نے کہا تھا نا تم کوئی سوال.....''

''اوہو.....سوری پاپا.....!''

اس نے کسمساتے ہوئے معافی مانگی۔

''ویسے بات بہت پرانی بھی نہیں ہے۔'' میں نے کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''یہی کوئی پچاس برس ہوئے ہوں گے.....یا ہوسکتا ہے سو دو سو برس پرانی ہو.....زیادہ سے زیادہ ہزار بارہ سو برس پرانی ہوسکتی

ہے یا پھر اس سے بھی زیادہ..... کہتے ہیں اس اونچی پہاڑی کے پیچھے ایک بستی تھی۔بستی البتہ سچ مچ بہت پرانی تھی، ہزاروں برس پرانی .....بستی میں اونچے اونچے مکان تھے، مکانوں میں بڑے بڑے دروازے اور چوڑی چوڑی کھڑکیاں تھیں، روشن اور کشادہ کمرے تھے، جہاں صبح وشام ہوا اٹھکھیلیاں کرتی گزرتی، مکانوں کے آنگنوں میں پھولوں کی کیاریاں لگی تھیں، جن میں رنگ برنگے پھول کھلتے تھے اور ہواؤں میں ہردم بھینی بھینی خوشبو رچی رہتی تھی بستی کے باہر باغات کا سلسلہ تھا، جن میں طرح طرح کے پھل اور پیڑ تھے، پیڑوں پر قسم قسم کے پرندوں کے گھونسلے تھے، پرندے صبح شام چہچہاتے رہتے، ان کی چہکار سے فضا میں موسیقی سی گھلتی رہتی بستی کے پاس سے ایک ندی گزرتی تھی جس سے آس پاس کی زمین سیراب ہوتی رہتی، انسان تو انسان ڈھور ڈنگر تک کو دانے چارے کی کمی نہیں تھی، کوئی موسم ہو، کھیتوں میں اناج کے خوشے جھومتے رہتے اور گایوں کے تھن ہمیشہ دودھ سے بھرے رہتے۔

بستی کے لوگ بڑے خوش مزاج، ملنسار اور امن پسند تھے، مرد دن بھر کھیت، کھلیانوں اور باغوں میں کام کرتے، مویشی چراتے، دودھ دوہتے اور عورتیں چولہا چکی سنبھالتیں۔ خالی وقت میں وہ ایک دوسرے کی دعوتیں کرتے، دعوتوں میں لذیذ کھانے کھاتے، عمدہ مشروب پیتے، جھومتے گاتے اور رقص کرتے۔ بوڑھے اطمنان سے مونچھوں کے نیچے مسکراتے، گردنیں ہلاتے رہتے، گرہستنیں اپنے بچمانوں پر واری جاتیں اور کنوارے، کنواریاں ایک دوسرے سے ہنسی ٹھول کرتے اور کبھی کبھی ہنسی ہنسی میں ایک دوسرے کو زندگی بھر کے لئے جیون ساتھی چن لیتے۔ان میں جو شہ زور تھے کشتیاں لڑتے، لاٹھی بلم کھیلتے، مصور تصویریں بناتے اور شاعر گیت گاتے تھے، خوشیاں روز اس بستی کا طواف کرتیں اور غم بھولے سے بھی اُدھر کا رخ نہ کرتے۔

کہتے ہیں بستی کے پاس ہی ایک گھنے پیڑ پر ایک پری رہتی تھی۔ ننھی منی، موہنی صورت اور معصوم سیرت والی، گلابی آنکھوں اور شہابی ہونٹوں والی سنہرے بالوں اور سرخ گالوں والی، رسرخ گالوں والی پری۔ پری گاؤں والوں پر بہت مہربان تھی۔ وہ اکثر اپنے چمکدار پروں کے ساتھ اڑتی ہوئی آتی اور ان کے روتے ہوئے بچوں کو گدگدا کر ہنسا دیتی۔لڑکیوں کے ساتھ ساون کے جھولے جھولتی، آنکھ مچولی کھیلتی، لڑکے بالوں کے ساتھ پیڑوں پر چڑھتی، ندی میں تیرتی، کبھی کسی کے کھلیان کو اناجوں سے بھر دیتی، کبھی کسی کے آنگن میں رنگ برنگے پھول کھلا دیتی۔شادی بیاہ، تیج تہوار، میلے ٹھیلے یہاں تک کہ موت مٹی میں وہ ہر جگہ، ہر موقع پر ان کے ساتھ رہتی۔بستی والے بھی اس کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ اگر وہ ایک دن بھی انھیں دکھائی نہیں دیتی تو وہ بے چین ہو جاتے۔

دن گزرتے رہے۔ وقت کا پرندہ کالے سفید پروں کے ساتھ اڑتا رہا اور موسم کا بہروپیا نت نئے روپ بدلتا رہا۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ ایک دن کسی نے ان کے کھیتوں میں شرارت کا ہل چلا دیا۔بس، اس دن سے ان کے کھیت تو پھیلتے گئے مگر دل سکڑنے لگے۔ گودام اناجوں سے بھر گئے۔مگر نیتوں میں کھوٹ پیدا ہو گئی۔اب وہ اپنی مقررہ زمینوں کے علاوہ دوسروں کی زمینوں پر بھی نظر رکھنے لگے۔ نتیجے کے طور پر ان کے کھیتوں میں بدکرداری کی فصل اگنے لگی اور درخت ریاکاری کا پھل دینے لگے۔لالچ نے ان کے دلوں

میں خودغرضی کا زہر گھول دیا تھا۔ پہلے وہ مل بانٹ کر کھاتے تھے۔مل جل کر رہتے تھے،مگر رفتہ رفتہ ان کی ہر چیز تقسیم ہونے لگی۔کھیت کھلیان، باغ، بغیچے، گھر آنگن یہاں تک کہ انھوں نے اپنی عبادت گاہیں تک آپس میں بانٹ لیں اور اپنے اپنے خداؤں کو ان میں قید کر دیا۔ان کی آنکھوں کی مروت اور دلوں کی حمیت ہتھیلی پر جمی سرسوں کی طرح اڑ گئی،تصویروں کے رنگ اندھے اور گیتوں کے بول بہرے ہو گئے،اب نہ کوئی تصویر بناتا تھا نہ کوئی گیت گاتا تھا، ہر گھڑی ہر کوئی ایک دوسرے کو زک دینے کی فکر میں رہتا۔آئے دن وہ ایک دوسرے کو برباد کرنے کے منصوبے بناتے رہتے۔

بستی والوں کے یہ بدلے ہوئے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ ننھی پری بہت دکھی ہوئی۔دو سوچنے لگی،آخر بستی والوں کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیوں ایک دوسرے کے بیری ہو گئے ہیں؟ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

وہ اب بھی بستی میں جاتی، بچوں کو گدگداتی اور عورتوں کے ساتھ گیت گاتی.....لڑکی،لڑکوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی.....پیڑوں پر چڑھتی،ان کے کھیت کھلیانوں کے چکر لگاتی،آنکھوں میں گھومتی پھرتی.....مگر اب وہ سب اس کی طرف بہت کم دھیان دیتے۔

بستی والوں کی اس بے توجہی کے سبب ننھی پری اداس رہنے گئی۔آخر اس نے بستی میں آنا جانا کم کر دیا۔اگر کبھی جاتی بھی تو ڈری ڈری سہمی سہمی ہی رہتی اور جتنی جلد ممکن ہوتا وہاں سے لوٹ آتی۔پھر ایک دن ایسا آیا کہ اس نے بستی میں آنا جانا بالکل ترک کر دیا۔

بستی والے آپس کے جھگڑے ٹنٹوں میں اس قدر الجھے ہوئے تھے کہ شروع شروع میں انھیں اس کی غیر موجودگی کا پتا تک نہیں چلا۔مگر جب سہاگنوں کے گیت بے سرے ہو گئے اور کنواریوں نے پیڑوں کی ٹہنیوں سے جھولے اُتار لیے اور بچے کھلکھلا کر ہنسنا بھول گئے تب انھیں احساس ہوا کہ انھوں نے اپنی کوئی قیمتی شئے کھو دی ہے۔بستی والے فکر مند ہو گئے۔اسے کہاں ڈھونڈیں، کیسے تلاش کریں؟

پہلے تو انھوں نے اسے اپنے گھروں اور آنگنوں میں تلاش کیا۔مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ پھر انھوں نے اسے کھیت کھلیان اور باغ بغیچوں میں ڈھونڈا.....وہ وہاں بھی نہیں تھی۔وہ ندی کے کنارے گئے،میدانوں میں بھٹکے، پیڑوں اور گچھاؤں میں دیکھا،مگر وہ کہیں نہیں تھی۔اب ان کی تشویش بڑھنے گئی۔مگر بجائے اس کے کہ وہ مل بیٹھ کر سر جوڑ کر اس کے بارے میں سوچتے، وہ ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگے کہ پری ان کی وجہ سے روٹھ گئی ہے۔اب تو وہ ایک دوسرے سے اور بھی بدگمان ہو گئے۔ان کے دلوں کی نفرت اور بھی گہری ہو گئی۔

اب انھوں نے ایک دوسرے کے کھیت کھلیانوں کو پامال کرنا اور مویشیوں کو چرانا شروع کر دیا۔دھوکہ، فریب،لوٹ مار،قتل و غارت گری روز کا معمول بن گیا.....اب نہ کسی کا جان و مال محفوظ تھا، نہ کسی کی عزت و آبرو سلامت تھی۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا، بوڑھے اپنے گھر کی چہار دیواریوں میں بیٹھے گڑگڑاتے اور دعائیں مانگتے رہتے اور جوان تلواریں اور نیزے لیے ایک دوسرے کی تاک میں گھومتے رہتے۔کوئی تلوار سے کسی کا سر قلم کر دیتا،کوئی نیزے سے کسی کا سینہ چھید دیتا۔معصوم انسانوں کے لیے روز بروز زمین تنگ ہوتی

جارہی تھی۔

جب پانی سر سے اونچا ہو گیا اور بچاؤ کی کوئی صورت نہ رہی تب بستی والوں نے طے کیا کہ اس روز روز کے قضیے سے بہتر ہے اس قصے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ وہ جان گئے تھے کہ جب تک کسی ایک فریق کا خاتمہ نہیں ہو جاتا، دوسرے کو راحت نہیں مل سکتی۔ لہٰذا انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے دشمن کو ختم کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

اس فیصلے کے بعد وہ دو گروہ میں بٹ گئے۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو گھروں میں بند کر دیا گیا اور سارے جوان ہاتھوں میں نیزے اور تلواریں لیے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں سے غصے اور نفرت کی چنگاریاں نکل رہی تھیں اور ان کی مٹھیاں نیزوں اور تلواروں کے دستوں اور قبضوں پر مضبوطی سے کسی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے حریف کو خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے اور ایک دوسرے پر جھپٹ پڑنے کو تیار کھڑے تھے۔

تبھی ایک انہونی ہو گئی، فضا میں ایک مہین سا سُر بلند ہوا۔ جیسے کسی پرندے کا ملائم پر ہوا میں لرز رہا ہو..... کوئی گا رہا تھا۔

انھوں نے آواز کی سمت دیکھا۔ پہلے تو انھیں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ مگر جب انھوں نے بہت دھیان سے دیکھا تو انھیں ننھی پری ایک پیڑ کی ڈال پر بیٹھی دکھائی دی۔ مگر آج اس کا روپ بدلا ہوا تھا، اس کے بال بکھرے ہوئے اور گال آنسوؤں سے تر تھے، پَر نُچے ہوئے اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے، جیسے وہ گھنی خاردار جھاڑیوں کے درمیان سے گزر کر آ رہی ہو، اس کے پاؤں ننگے اور تلوے زخمی تھے۔ وہ پیڑ سے اُتر کر میدان کے بیچ میں آ کر کھڑی ہو گئی، اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر رکھے تھے جیسے انھیں ایک دوسرے پر حملہ کرنے سے روکنا چاہتی ہو۔

تلواروں کے دستوں اور نیزوں پر کسی ہوئی مٹھیاں قدرے ڈھیلی ہوئیں۔ وہ گا رہی تھی۔ اس کی آواز دھیرے دھیرے بلند ہوتی گئی، بلند ہوتی گئی، اتنی بلند جیسے ستاروں کو چھونے لگی ہو، اس کی آواز چاروں دِشاؤں میں پھیلنے لگی۔ پھیلتی گئی، پھیلتی گئی، اتنی پھیلی کہ چاروں دِشائیں اس کی آواز کی بازگشت سے گونجنے لگیں۔ لوگ حیرت سے آنکھیں پھاڑے، منھ کھولے اس کا گیت سنتے رہے، سنتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے ہاتھوں میں دبی تلواریں پھولوں کی چھڑیوں میں تبدیل ہو گئیں اور نیزے مور چھیل بن گئے۔

انھوں نے محسوس کیا کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمی برف پگھل رہی ہے اور ان کے دلوں کی کدورت آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ رہی ہے۔ پچھتاوے اور شرمندگی سے ان کی گردنیں جھک گئیں۔ گیت کے بول ان کے کانوں میں رس گھولتے رہے اور دھیرے دھیرے وہ سب ایک دوسرے سے ایک ان دیکھی، ان جان ڈور سے بندھتے چلے گئے، جیسے وہ سب ایک ہی مالا کے موتی ہوں، جیسے دو سب ایک ہی ماں کے جائے ہوں۔

اُدھر گیت ختم ہوا اور وہ اپنی آستیوں سے آنسو پونچھتے ہوئے ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

جب اشکوں کا غبار کم ہوا تو انھوں نے اپنی محسن کو تلاش کرنا چاہا مگر وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ بستی والوں نے اسے بہت ڈھونڈا، وادی وادی، جنگل جنگل آواز دی، منتیں کیں، واسطے دیے.....مگر وہ دوبارہ ظاہر نہیں ہوئی۔ تب بستی والوں نے اس کی یاد میں ایک مجسمہ بنایا، اسے بستی کے بیچوں بیچ میدان میں نصب کر دیا۔

کہتے ہیں آج بھی بستی کے لوگوں میں جب کوئی تنازعہ ہوتا ہے، سب میدان میں اس مجسمے کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس گیت کو دہرانے لگتے ہیں۔ گیت کے ختم ہوتے ہوتے ان کے دل کی سلیٹیں دوبارہ اُجلی اور صاف ہو جاتی ہیں، جیسے بارش کی پہلی پھوار سے پیڑوں کے پھول پتے دُھل جاتے ہیں۔ اس طرح بستی والے آج بھی اس گیت کی بدولت بڑے امن اور چین سے زندگی بسر کر رہے ہیں.....جیسے ان کے دن پھرے، خدا ہم سب کے بھی دن پھیر دے''

میں نے کہانی ختم کر کے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے عجیب نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا، چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ''چلو اب سو جاؤ، کہانی ختم ہو چکی ہے۔''

اس نے کہا۔ پاپا! آپ نے کہا تھا، کہانی سناتے وقت بیچ میں کوئی سوال نہیں پوچھنا۔''

''ہاں.....میں نے کہا تھا اور تم نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ تم بڑے اچھے بچے ہو۔ چلو سو جاؤ

''مگر پاپا کہانی تو ختم ہو گئی۔ میں اب تو سوال پوچھ سکتا ہوں نا...؟

میں نے ایک لمحہ توقف کیا۔ پھر بولا ''چلو پوچھو.....کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

''پاپا اور کون سا گیت تھا، جسے سن کر گاؤں والے دوبارہ گلے ملنے پر مجبور ہو گئے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر چپ رہا، پھر بولا۔ ''مجھے وہ گیت یاد نہیں ہے بیٹا۔''

''کیوں پاپا آپ کو گیت کیوں یاد نہیں؟''

''کیوں کہ میرے پاپا یعنی تمہارے دادا نے بھی جب مجھے یہ کہانی سنائی تھی تو صرف کہانی سنائی تھی، گیت نہیں۔''

''آپ نے ان سے پوچھا نہیں.....؟

''شاید ان کے پاپا نے بھی انھیں صرف کہانی سنائی ہو۔''

''نہیں پاپا.....! میرے بیٹے نے مچلتے ہوئے کہا۔

''مجھے وہ گیت سنائیے ورنہ میں سمجھوں گا کہ آپ کی کہانی ایک دم جھوٹی تھی۔''

☆☆☆☆☆

یوسف عارفی

جھوٹ

کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ اس شخص نے مجھے بتایا تھا..... جب میرا قد پانچ فٹ اور چند انچ ہو جائے گا تب میرے چاروں طرف اندھیرا ہوگا، اندھیروں کے سوائے کچھ نہ ہوگا۔ میرے آگے جاتے اور پیچھے آتے لوگ گرتے پڑتے چل رہے ہوں گے۔ اس افراتفری کے عالم میں یہ بتانا نہایت دشوار ہوگا کہ کون کتنا ضرورت مند، دکھی اور اور بے بس ہے کہ..... چاروں طرف یکساں اندھیرا ہوگا.....

''لیکن یہ کس نے مجھے بتایا.....؟

میں اس وقت ایک ننھے معصوم لڑکے کی سفید چمکتی آنکھوں میں دیکھ کر سوال کر رہا ہوں جو میرے دائیں جانب والے قیمتی صوفے میں دھنسا اپنے آپ باتیں کئے جا رہا ہے۔ میں اس لڑکے کے بے حد قریب پہنچ کر خود ہی جواب دیتا ہوں۔

''مجھے یہ بات بتانے والے میرے باوا تھے یعنی میرے باپ! اور میں تمہارا کیا لگتا ہوں.....؟''

''آپ میرے ابا ہیں یعنی ڈیڈ!'' میں اس معصوم لڑکے میں اپنے ہی لہجے کی نامعقولیت محسوس کرتا ہوں۔

''کیا تم ان اندھیروں کی ڈگر پار کر سکو گے، جن کے بارے میں میرے باپ نے میرے لئے پیشن گوئی کی تھی'' میرے ذہن میں یہ سوال بجلی کی طرح کوندتا ہے..... اور بادل سے گڑگڑاتے ہیں۔

''شاید!''

تشویش جو میرا مقدر تھی۔

تشویش جو تمہارا مقدر بنے گی.....

میں اپنے معصوم لڑکے کی جھیل جیسی شفاف آنکھوں میں جھانکتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے ہم دونوں کی آنکھیں کپکپا رہی ہیں..... اور یہ کپکپاہٹ شاید ٹانگوں تک اترتی چلی آئے۔ لیکن اندھیروں والی بات اس نے میرے لئے کہی تھی جو میرا باپ تھا اور میں تمہارا ابا ہوں یعنی ڈیڈ!..... اس لئے یہ بات میں تمہارے سامنے ہرگز نہیں دہراؤں گا کہ سماجی ناہمواری کی تعفن زدہ ہواؤں کا مقابلہ کرنے کی مجھ میں بھرپور طاقت ہے۔

''میں نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ بیش قیمت الماریوں میں ترتیب سے رکھی ہوئی ادب، فلسفہ، تصوف، مذہب ..... لاحول ولاقوۃ..... انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس، جرائم سے بچنے کے عمدہ طریقے، دولت بٹورنے کا آسان طریقہ اور..... اور..... وغیرہ وغیرہ..... یہ

ساری کتابیں! میں نے .....اپنی آنکھوں پر لگی فینسی عینک درست کی ..... یہ ساری کتابیں، میرے پاس ہر آنے جانے والے کو مرعوب کرنے کے لئے کافی ہیں..... یہاں تک کہ تم بھی ان کتابوں کی ضخامت اور شان وشوکت دیکھ کر کچھ زیادہ ہی مرعوب نظر آتے ہو، اور سنو! اس قلمدان پر سجے قیمتی قلم کتنے اچھے لگتے ہیں۔ ..... میں نے قلم اٹھایا..... اور ایک خوبصورت پیڈ کے شفاف کاغذ پر اردو، ہندی اور انگریزی کے حروف تہجی کو جوڑ جوڑ کر اپنا نام لکھنے کی کوشش میں لگا رہا..... پھر اپنی عرق آلود پیشانی کو صاف کرتا اس معصوم لڑکے کو دیکھا اور کہا.....

''کبھی وہ بھی دن تھے..... جب میں پڑھتا لکھتا تھا.....لیکن افسوس اس نامعقول کام نے مجھے سوائے پریشانی اور بے بسی کے کچھ نہیں دیا، تب میں نے سوچا جو شئے کہ ناہمواری، بے بسی اور سراسیمگی دیتی ہے، اس شئے سے دور..... بہت دور رہا جائے کہ.....اس کے راستے اندھیروں کا رخ کرتے ہیں۔

میں نے اپنی کنپٹی کی تڑپتی رگیں سہلائیں اور بے حد ضبط کے ساتھ اپنے معصوم لڑکے کی ٹائی کی گرہ درست کی اور ٹیبل پر جگمگاتے اس سرخ بٹن پر انگلی رکھ دی۔ یہ سرخ بٹن ہی کبھی کبھی میری کنپٹی کی تڑپتی رگوں کو سکون بخشتا ہے۔ میں نے اس بٹن کا انتخاب مس ڈالی کے سرخی مائل ہونٹوں کو بغور دیکھنے کے بعد کیا ہے۔ ڈالی کے ہونٹ!

قاتل مسکراہٹ اور مہکتی اداؤں کے ساتھ مس ڈالی سامنے والے دروازے سے نمودار ہوئی۔ میں نے اپنی بھوئیں نچائیں۔ میرا معصوم لڑکا مس ڈالی کو بڑی لاپروائی سے دیکھتا رہا۔

''سنو بیٹے'' میں نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی اور پوچھا'' کیا تم بتا سکے ہو..... یہ تمہاری کیا لگتی ہیں؟''

''مس ڈالی!'' وہ تڑ سے بول پڑا۔ میری پیشانی پر ہلکے سے بل پڑ گئے۔

'' غلط .....غلط .....'' اس سے آگے کہ میں چیخ پڑتا۔ مس ڈالی نے بڑی سرعت اور قاتل مسکراہٹ کے ساتھ میرے ہونٹوں پر بلوریں جام لگا دیا۔

''نہیں.....!'' میں نے بلوریں جام کو بڑی حقارت سے ہٹا دیا'' نہیں ایسی گستاخی مستقبل کے بہت بڑے دولت مند کے سامنے نہیں کی جاسکتی'' مس ڈالی کانسی کے برتنوں کی طرح کھنکتی ہنسی ہنسنے لگی، پھر فرج میں رکھی جوس کی بوتلیں نکالنے لگی۔

یہ مشکوک جوس سے بھری بوتلیں میں نے ان لوگوں کے لئے رکھ چھوڑی ہیں، جن کی رگوں میں دوڑتا لہو میرے یہاں آنے کے بعد کچھ زیادہ ہی مشکوک ہو جاتا ہے۔

''تم میرے بیٹے کو تازہ پھل دیتی رہو، تاکہ ہمہ وقت تازگی اس کا مقدر بنی رہے''

مس ڈالی میرے اس مشورے پر دوبارہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور میرے بیٹے کے تازہ گلابوں کی طرح کھلے گالوں کو للچائی نظروں سے

دیکھتی ہوئی پوچھنے لگی۔

''برا نہ مانیں تو ہم آپ کے ان گالوں کو چوم لیں''

''میرے برخوردار پر پیار وار کا چکر مت چلاؤ، کیوں کہ اسے مقابلہ کرنا ہے ان زہریلی ہواؤں کا جنہیں شاعر لوگ آج بھی بادِ صبا کا نام دیتے ہیں، اسے اٹھنا بیٹھنا ہے ان جہاں دیدہ لوگوں کے درمیان جو امن عالم کے خواہاں ہیں اور جن کا نام.....اپنے باپ کے نام کو چمکائے گا۔ تب میری خوشیاں، میری مسرتیں..... یک بیک میں نے محسوس کیا، میری کنپٹی کی رگیں تڑپنے لگی ہیں۔ عجلت میں، میں نے شہادت کی اگلی سرخی مائل بٹن پر رکھ دی، اور اپنی آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا۔

جاہل اور موقع پرست تاجر..... عالی شان بننے کے جنون میں کتنا ادھورا اور بے وقوف سا لگتا ہے.....اور پسماندہ ملکوں کی وہ بے نام اور بے بس نسل جو موقع پرستی سے ناواقف ہے اور جس کے اعلیٰ ترین ذہن کو پھانسی دی جاتی ہے.....لیکن سوال یہ ہے کہ نسل کو پھانسی دی جاتی ہے یا ذہن کو؟

اور فلسطین کے قرینے سے سجے وہ شائستہ بازار بم کے دھماکوں سے اڑا دئے گئے کہ ایمانداری، نیک نیتی اور سچائی فلسطنیوں کا مذہب ہے۔ اور جن کی چیخ.....آہ و بکا.....جو آج بھی چاروں دشاؤں میں گونجتی ہے، نہ جانے کب تک گونجتی رہے گی۔

اور ویٹ نام کی وہ قیدی لڑکی جس نے چار خون خوار فوجیوں کے سامنے خود کو اس آرزو کے ساتھ برہنہ کر دیا تھا کہ پانچواں فوجی جو اس کا عاشق بھی تھا اور دشمن بھی، اس کی مردہ لاش کو پکی قبر میں نہ سہی، کم از کم اپنی آنکھ کے آنسوؤں سے دفن کر دے گا۔

جب کبھی میں اس طرح سوچنے لگتا ہوں تو..... مجھے لگتا ہے ''نزع کا وقت قریب تر آتا آ جا رہا ہے.....اور جو کچھ کہ میں نے اپنے اطراف سجا رکھا ہے اس سے میری کوئی وابستگی نہ ہوگی، ان پر میرا کوئی حق نہ ہوگا کہ ہر شئے کو ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جانا ہے۔

یہ سچ ہے کہ بکھرنے کے اس عمل کو میں نے فلسطین میں، ویٹ نام میں اور کشمیر میں سن رکھا ہے، لیکن بکھرنے کے اس عمل کو میں نے پہلی بار اس وقت محسوس کیا تھا..... جب مولوی صاحب بڑے جلالی لہجے میں '' قیامت کے بیان'' پر تقریر فرما رہے تھے۔ میں مولسری کے پیڑ سے لگا مولوی صاحب کی زبانی سن رہا تھا۔

''حشر کے دن نفسا نفسی کا عالم ہوگا۔ دنیاوی رشتے، ساز و سامان اور تعیش کی فراوانی سب کچھ دھری رہ جائے گی'' تب اچانک مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید..... یہ مولسری کا درخت جس کے پیڑ تلے میں بیٹھا ہوں، دھڑام سے گر پڑے گا، اور میری ہڈی ہڈی ریزہ ریزہ ہو جائے گی ..... پھر میں بھرے مجمع سے حواس باختہ ہو کر بھاگ آیا تھا.....اور مولوی صاحب کی گرج دار آواز میرا تعاقب کر رہی تھی۔

''جولوگ خدا سے خوف نہیں کھاتے وہ موت سے ڈرتے ہیں.....اس لئے خدا کو یاد کرتے رہنا چاہیے''

''مس ڈالی.....!''میں چیخ پڑا، اور عالم نزع میں بڑبڑانے لگا'' خدا کو یاد کرنا چاہیے'' میری بڑبڑاہٹ سن کر مس ڈالی کانسی کے برتنوں کی طرح کھنکتی ہنسی ہنسنے لگی۔

''بدتمیز! خدا کا نام سن کر تم ہنستی ہو؟''میں دانت پیستا ہوا اٹھا، لیکن مس ڈالی جس دروازے سے داخل ہوئی تھی اسی دروازے سے غائب ہوگئی۔ مجھے مس ڈالی کا اس طرح غائب ہوجانا کبھی اچھا لگتا ہے اور کبھی کبھی خود پر جھلاتا ہوں کہ..... یہ کیسی بے بسی ہے کہ میں کچھ بھی نہیں کر پاتا.....صرف اس کی محبت میں اکیلا تڑپنے لگتا ہوں۔

میں نے نہایت صبر وضبط کے ساتھ آفس روم کی ایک ایک شئے کو دیکھا یہ موٹی ضخیم بارعب کتابوں سے سجی الماری، وسیع وعریض باوقار ٹیبل، ٹیبل پر رکھا ہاتھی دانت کا بیش قیمت قلمدان، خوصورت رائٹنگ پیڈز.....اور یہ گھومنے والی نرم ملائم آرام دہ چیر.....اس چیز پر بیٹھا میں بھلا کیسا لگتا ہوں۔

ایک باوقار دولت مند

ایک کامیاب بزنس مین

بالکل چغد لگتے ہو تم!.....آہستہ روقدموں سے چل کر میں آرام دہ چیر میں دھنس گیا ہوں.....آنکھیں موندے سوچنے لگا ہوں.....اس شان وشوکت سے سجے آفس روم کے پراسرار اجالے میں، میں اور یہ.....یعنی میں اور میرا معصوم بیٹا..... ایک دوسرے کی موجودگی سے باخبر ہوتے ہوئے بھی بے خبر بیٹھے ہیں.....اور ایک بازگشت سی سنائی دے رہی ہے کہ.....''جب تمہارا قد پانچ فٹ اور اور چند انچ ہوجائے گا۔ تب تمہارے اطراف.....تمہارے اطراف'' میں اس سے آگے کچھ بھی نہیں سن رہا ہوں.....کہ میرے باپ نے جو کچھ مجھے بتایا تھا.....وہ کتنا بڑا جھوٹ تھا.....!

☆☆☆☆☆

محمود ایاز

بازیافت

گزرے ہوئے ماہ وسال کے غم
تنہائی شب میں جاگ اٹھے ہیں
عمر رفتہ کی جستجو میں
اشکوں کے چراغ جل رہے ہیں

آسائش زندگی کی حسرت
ماضی کا نقش بن چکی ہے
حالات کی ناگزیر تلخی
ایک ایک نفس میں بس گئی ہے

ناکامیٔ آرزو کو دل نے
تسلیم و رضا کے نام بخشے
ملنے کی خوشی، بچھڑنے کا غم
کیا کیا تھے فریب زندگی کے

اک عمر میں اب سمجھ سکے ہیں
خوشیوں کا فسوں گریز پا ہے
اب ترک دعا کی منزلیں ہیں
دامان طلب سمٹ چکا ہے

ناکامیٔ شوق مٹتے مٹتے
جینے کا شعور دے گئی ہے
یہ غم ہے نوائے شب کا حاصل
یہ درد متاع زندگی ہے

اجڑی ہوئی ہر روش چمن کی
دیتی ہے سراغ رنگ و بو کا
ویران ہیں زندگی کی راہیں
روشن ہے چراغ آرزو کا

دلاور فگار

شکواہ، جوابِ شکواہ

(شاعر کا کے ڈی اے سے شکوہ
علامہ اقبال کے شکوے کی ایک آزاد پیروڈی)

کیوں گنہگار بنوں، فرض فراموش رہوں
کیوں نہ اک فرض ادا کر کے سبکدوش رہوں
شہر میں شور سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
کے ڈی اے میں کوئی بدھو ہوں کہ خاموش رہوں

وجہ تکلیف ترا چال چلن ہے مجھ کو
شکوہ ڈی جی سے بھی خاکم بدہن ہے مجھ کو

کے ڈی اے تجھ سے گلہ کرنے پہ مجبور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
گھر سے محروم ہیں پانی سے بہت دور ہیں ہم
ایک مدت سے کراچی میں بدستور ہیں ہم

کے ڈی اے شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ مدح سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

کے ڈی اے شہر میں تو ایک ادارہ ہے قدیم
تیرے اسٹاف نے پائی تو ہے اونچی تعلیم
شرط انصاف ہے اے دفتر اولاد یتیم
ہیں حقیقت میں ہمیں شہر کراچی کی کریم

ہم کو جمعیت خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ اس شہر میں ویرانی ہی ویرانی تھی

کون کہتا ہے کہ نیچر ہے کراچی میں بخیل
کون کہتا ہے کہ قدرت کے وسائل ہیں قلیل
اک طرف بحر عرب، دوسری جانب اک جھیل
پھر بھی پانی کی یہاں رہتی ہے اکثر تعطیل

کے ڈی اے کچھ تو بتا کیوں یہ ستم رانی ہے
تو مسلمان ہے.، یہ انداز مسلمانی ہے
شکل تک اپنی دکھاتا نہیں دن بھر پانی
رات کے ڈیڑھ بجے آتا ہے اکثر پانی
ہم کو سونے نہیں دیتا یہ، مقطر پانی
بھریں کسی طرح جو دفتر میں ہیں نوکر پانی

صبح درخواست میں کیا وجہ یہ لکھی جائے
میں نے کل پانی بھرا تھا مجھے چھٹی دی جائے

کے ڈی اے تجھ کو یہ لازم ہے کہ دے اس کا جواب
کیوں مسلمانوں کو ملتا نہیں اک قطرہ آب
تیری قدرت تو وہ ہے جس کی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو آگے سندھ میں فصل پنجاب

مستقل نزلہ ہے، بیماری ہے، بیکاری ہے
کیا ترے شہر میں رہنے کا عوض خواری ہے

جواب شکوہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
نیوز بن جاتی ہے پیپر میں گزر رکھتی ہے
اپنے راوی کی جسامت پہ نظر رکھتی ہے
اس کا کیا حشر ہوا یہ بھی خبر رکھتی ہے

کے ڈی اے تک میرے شکوے کی خبر جا پہنچی
نہ پہنچنا تھا وہاں اس کو مگر جا پہنچی

آئی آواز شرانگیز ہے افسانہ ترا
بادہ تلخ سے لبریز ہے پیمانہ ترا

بجھ گئی شمع تری مر گیا پروانہ ترا
اپنے آپے میں نہیں ہے دل دیوانہ ترا

بہر تنقید یہ اک نظم جو لکھ ڈالی ہے
تو نے اغبار سے رشوت تو نہیں کھائی ہے

پانی لانے میں ہر افتاد اٹھائی ہم نے
کوہساروں پہ کہیں سر چڑھائی ہم نے
کہیں بارود سے چٹان اڑائی ہم نے
کہیں اک جوئے زمیں دوز بنائی ہم نے

بے عمل کہہ کے ہمیں تم نہ پکارو دیکھو
دھانیجی جاؤ کبھی اور کبھی گھارہ دیکھو

ختم جب ہو گئی پونجی تو یہ پانی آیا
نہ رہی جیب میں کوڑی تو یہ پانی آیا
مر گئے کتنے ہی ساتھی تو یہ پانی آیا
جان مزدوروں نے دیدی تو یہ پانی کیا

ان کی خدمت کا تم اندازہ نہیں کر سکتے
یاد تک ان کی کبھی تازہ نہیں کر سکتے

وہ خلیلی ہوں، ہمایوں ہوں کہ ہوں وہ رضوی
سومرد ہوں کہ ہوں اعوان کہ مسعود نبی
مدنی ہوں کہ ہوں روئیداد کہ ہوں احمد علی
نقش اس شہر کے دل پر ہے حکایت ان کی

شہر آئینہ ہے ان سب کی خردمندی کا
پھل یہ ہے کتنے ہی ہاتھوں کی چمن بندی کا

یہ بھی واضح رہے پانی کے وسائل نہیں قلیل
سندھ دریا ہے کراچی سے کوئی اسی میل
آہ تم نے کبھی دیکھی ہی نہیں کلری جھیل
اب کے سنڈے کو وہاں جا کے گزارو تعطیل

گھر میں کیوں بند ہو باہر تو نکل کر دیکھو
ہائی وے کیسی ہے موٹر پہ پھسل کر دیکھو

سلیمان خطیب

پیارا وطن ہمارا

نیلے گگن میں جیسے چاندی کا اک کبوتر
دنیا کی آرزو ہے پیارا وطن ہمارا
ہر بات سیدھی سیدھی گیتا کا پاٹھ جیسے
گوتم کی گفتگو ہے پیارا وطن ہمارا
خسرو کے گیت جس میں تلسی کے پیارے دوہے
اک پیار کا سبو ہے پیارا وطن ہمارا
اک آفتاب تازہ دھیرے ابھر رہا ہے
پورب کا خوبرو ہے پیارا وطن ہمارا
انمول جس کے موتی کیا لعل ہیں جواہر
باپو کی جستجو ہے پیارا وطن ہمارا
ڈرتے ہیں کب کسی سے ٹیپو کے دیش والے
بلوان کا لہو ہے پیارا وطن ہمارا
کعبہ ہے یہ کلیسا آؤ طواف کر لیں
کاشی کی آبرو ہے پیارا وطن ہمارا
اللہ رکھے سلامت رنگ بہارا اپنا
پھولوں کا رنگ و بو ہے پیارا وطن ہمارا

مخدوم محی الدین

چپ نہ رہو

شب کی تاریکی میں اک اور ستارہ ٹوٹا
طوق توڑے گئے ٹوٹی زنجیر
جگمگانے لگا ترشے ہوئے ہیرے کی طرح
آدمیت کا ضمیر
پھر اندھیرے میں کسی ہاتھ میں خنجر چمکا
شب کے سناٹے میں پھر خون کے دریا چمکے
صبح دم جب مرے دروازے سے گزری ہے صبا
اپنے چہرے پہ ملے خون سحر گزری ہے
خیر ہو مجلس اقوام کی سلطانی کی
خیر ہو حق کی صداقت کی جہاں بانی کی
اور اونچی ہوئی صحرا میں امیدوں کی صلیب
اور اک قطرۂ خوں چشم سحر سے ٹپکا
جب تلک دہر میں قاتل کا نشاں باقی ہے
تم مٹاتے ہی چلے جاؤ نشاں قاتل کے
روز ہو جشن شہیدان وفا چپ نہ رہو
بار بار آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو
چپ نہ رہو!

مولوی عبدالحق

اسم اوراس کی قسمیں

اسم وہ لفظ ہے جو کسی کا نام ہو

اسم کی دو قسمیں ہیں

ا۔خاص ۲۔عام

خاص:

کسی شخص یا شئے یا مقام کا نام۔مثلاً علاءالدین،کلکتہ،گنگا

عام:

وہ اسم ہے جو ایک قسم کے تمام افراد کے لئے فرداً فرداً استعمال ہو سکے جیسے آدمی،گھوڑا،درخت،کتاب

اسم خاص:

اشخاص کے اسم خاص بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں۔مثلاً

ا۔خطاب: نام جو بادشاہ یا سرکار دربار سے اعزازی طور پر ملتا ہے۔اقبال الدولہ،عمادالملک۔

۲۔لقب: ایک وصفی نام جو کسی خصوصیت یا وصف کی وجہ سے پڑ گیا ہو۔جیسے مرزا نوشہ لقب ہے اسداللہ خاں غالب کا یا کلیم اللہ لقب ہے حضرت موسیٰ کا۔

۳۔عرف: وہ نام ہے جو محبت یا حقارت کی وجہ سے پڑ جائے یا اصل نام کا اختصار لوگوں کی زبان زد ہو جائے۔جیسے چٹو،کلن،فخرو،اچھے میاں

۴۔تخلص: ایک مختصر نام جو شاعر نظم میں بجائے اصلی نام کے داخل کر دیتے ہیں۔مثلاً غالبؔ تخلص ہے مرزا اسداللہ خاں کا۔حالیؔ تخلص ہے مولانا الطاف حسین کا۔

اس کے علاوہ ممالک،دریاؤں اور پہاڑوں کے اور دیگر جغرافیائی اسماء اور علم وفنون وامراض وغیرہ کے نام سب اسم خاص ہوں گے۔

بعض اوقات اسم خاص اسم کی صفت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔جیسے رستم،حاتم وغیرہ مثلاً یوں کہیں کہ وہ شخص اپنے وقت کا حاتم ہے۔یا وہ رستم ہند ہے یا فلاں شخص قیس یا فریاد ہے۔یا وہ سعدی یا کالیداس ہے۔ایسے موقعوں پر رستم سے بڑا پہلوان،حاتم سے بڑا سخی ،قیس وفریاد سے بڑے عاشق،سعدی اور کالیداس سے بڑے شاعر مراد ہیں۔

اردو میں اسم عام کئی قسم کے ہوتے ہیں۔

اسم کیفیت، اسم جمع، اسم ظرف، اسم آلہ اس کی چند قسمیں ہیں۔

اسم کیفیت:

وہ اسم ہے جس سے کوئی خاص حالت یا کیفیت معلوم ہوتی ہو۔ جیسے سخی، روشنی، صحت، جلن۔

اسمائے کیفیت دو چیزیں ظاہر کرتے ہیں۔

اول حالت جیسے صحت، نیند، رفتار، سچ، جھوٹ۔

دوم وصفی کیفیت مثلاً درد، خوشی، مطالعہ۔

اسمائے کیفیت کیونکر بنتے ہیں؟

۱۔ بعض فعل سے بنتے ہیں۔ مثلاً چال چلن، گھبراہٹ، لین دین۔

۲۔ بعض صفت سے بنتے ہیں۔ مکاری، خوشی، کھٹائی، دیوانہ پن۔

۳۔ بعض اسم سے بنتے ہیں۔ جیسے دوست سے دوستی، لڑکے سے لڑکپن

۴۔ اکثر عربی، ہندی، فارسی کے الفاظ اسمائے کیفیت کا کام دیتے ہیں۔ جیسے: صحت، حسن، حرکت، بل، کوشش، جوش۔

۵۔ ایک لفظ کی تکرار یا دو لفظوں کے ملنے سے۔ جیسے بک بک، چھان بین، جان پہچان، خوشبو ر۔

اسم ظرف:

وہ اسم ہے جس میں جگہ یا وقت کے معنی پائے جائیں۔ مثلاً گھر، میدان، جھرنا، چراگاہ۔

بعض علامات ایسی ہیں کہ ان کے لگانے سے اسم ظرف بن جاتا ہے۔ بعض ان میں سے ہندی ہیں اور بعض فارسی۔

ہندی علامات سال (بمعنی جگہ) جیسے گھڑ سال (گھوڑوں کے رہنے کی جگہ)۔ ٹکسال (جہاں ٹکے یعنی سکہ بنایا جاتا ہے)۔

شالہ یا سالہ جیسے دھرم سالہ، پاٹ شالہ، گئو سالہ۔ استھان (فارسی ستان) دیواستھان، پرستان، آل۔ یال جیسے: سسرال، ننھیال، ددھیال ۔ آنہ: سمدھیانہ، سرھانہ۔ کا: جیسے میکا (ماکا)

بعض خاص الفاظ دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر اسم ظرف کے معنی دیتے ہیں۔ مثلاً ٹولہ سے قاضی ٹولہ

کھاٹ یا گھٹ: مرگھٹ، پن گھٹ، دھوبی گھاٹ واڑہ، باڑہ۔ جیسے سیدواڑہ، قصائی باڑہ۔ واری۔: پھلواری۔ پارہ۔ جیسے: اوپر پارہ

دوار، دوارہ۔ جیسے ہردوار، گردوارہ، ٹھاکردوارہ

گھر۔ جیسے: ڈاک گھر، ریل گھر، ناچ گھر

نگر۔ جیسے سری نگر، احمد نگر۔

پور، پورہ۔ جیسے غازی پور، شولا پور، عثمان پورہ

گڈھ۔ جیسے علی گڈھ، آسمان گڑھ۔

منڈی۔ جیسے: دال منڈی، سبزی منڈی۔

فارسی علامات:

خانہ۔ کتب خانہ۔ ہندی وغیرہ الفاظ کے ساتھ جیسے چنڈو خانہ، چڑیا خانہ، جیل خانہ، ڈاک خانہ

گاہ۔ چراگاہ، شکارگاہ، بارگاہ، درگاہ۔

دان۔ چاءدان، قلم دان، عطردان، ہندی الفاظ کے ساتھ۔ جیسے پاندان، خاصدان، پیک دان۔

دانی (ہندیوں کا تصرف ہے) سرمہ دانی، تلے دائی۔

زار۔ سبزہ زار، لالہ زار، مرغزار۔

سار۔ کوہسار۔

ستان۔ گلستان، پرستان، کوہستان۔

سرا۔ جیسے: کارواں سرا۔ مہمان سرا۔ کدہ۔ جیسے: آتش کدہ۔

آباد۔ حیدرآباد، اورنگ آباد، اکبرآباد۔

شن۔ گلشن

بعض اوقات فعل سے بھی اسم ظرف بنتا ہے۔ مثلاً بیٹھنا سے بیٹھک، پینا سے پیاؤ۔

کبھی فعل اور اسم کے ملنے سے اسم ظرف بنتا ہے۔ مثلاً بُدرُود، آب چک۔

رمنا اور جھرنا دونوں مصدر ہیں۔ مگر یہ اسم ظرف کے معنوں میں بھی مستعمل ہیں۔ رمنا کے معنی پھرنے کے ہیں۔ ظرفی معنی پھرنے کی جگہ یعنی چراگاہ کے ہیں۔ جھرنا کے معنی پانی رسنے کے ہیں۔ ظرفی معنی وہ مقام جہاں سے پانی رستا ہے۔

عربی میں اسم ظرف مفعل اور مفعلہ کے وزن پر آتے ہیں۔ ان میں سے اکثر اردو میں بھی رائج ہیں۔ مثلاً مکتب، مدرسہ، مقبرہ، مسجد، مجلس، مرقد، مقام، مزار، محشر، مقتل، منبع، مخرج، ماخز وغیرہ۔

اسم آلہ:

وہ اسم جو آلہ یا اوزار کے معنوں میں آئے۔ مثلاً چاقو، تلوار، ہتوڑا، درانتی۔

۱۔بعض اسم آلہ فعل سے بنائے گئے ہیں۔

بیلنا سے بیلن، جھولنا سے جھولا۔

دھونکنا سے دھونکنی، جھاڑنا سے جھاڑو۔

چھاننا سے چھلنی، پھانسنا سے پھانسی۔

لٹکنا سے لٹکن، کترنا سے کترنی، پھونکنا سے پھکنی۔

۲۔بعض اسم سے بھی بنتے ہیں۔جیسے:

نہرنا یا نہرنی (بہ معنی ناخن)

ہتوڑا (ہاتھ سے)

دتون (دانت ہے)

۳۔دو اسم مل کر جیسے: دستپنا (دست پناہ) منال (منہ، نال)

۴۔فارسی اسماء کے آگے بعض علامات یا الفاظ بڑھانے سے بنائے گئے ہیں:

ہ کے بڑھانے سے: جیسے دست سے دستہ، چشم سے چشمہ۔

آنہ۔جیسے: انگشت سے انگشتانہ، دست سے دستانہ۔

گیر۔جیسے: کف گیر، گلگیر، آتشگیر۔

کش۔جیسے: بادکش، دودکش۔

تراش۔جیسے: قلم تراش

دان۔جیسے چوہے دان، قلم دان۔

۵۔عربی کے اسمائے آلہ جو اکثر مفعل مفعلہ یا مفعال کے وزن پر ہوتے ہیں۔اردو میں بھی مستعمل ہیں۔مثلاً: مقراض، مشعل، منقار، مسواک، میزان، مضراب، مسطر، منبر،

اسم جمع:

بعض اسم ایسے ہوتے ہیں کہ صورت میں تو واحد معلوم ہوتے ہیں۔لیکن حقیقت میں کئی اسموں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔جیسے فوج، انجمن، قطار، جھنڈ۔اس قسم کے اسم کو اسمِ جمع کہتے ہیں۔

.....

مولوی عبدالحق

ضمیر

وہ الفاظ جو بجائے اسم کے استعمال کئے جاتے ہیں، ضمیر کہلاتے ہیں۔ جیسے وہ نہیں آیا۔ میں آج نہیں جاؤں گا۔ اس میں (وہ) اور (میں) ضمیر ہیں۔ ضمیر سے فائدہ یہ ہے کہ بار بار انھیں اسماء کو جو گزر چکے ہیں دہرانا نہیں پڑتا اور زبان میں الفاظ کے دہرانے سے جو بدنمائی پیدا ہو جاتی ہے، وہ نہیں ہونے پاتی۔

ضمیر کی قسمیں

(۱) شخصی (۲) موصولہ (۳) استفہامیہ (۴) اشارہ (۵) تنکیر

(۱) ضمیر شخصی:

وہ ہے جو اشخاص کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ اس کی تین صورتیں ہیں۔

ایک وہ جو بات کرتا ہے۔ اسے متکلم کہتے ہیں۔

دوسرا وہ جس سے بات کی جاتی ہے۔ اسے مخاطب کہتے ہیں۔

تیسرا وہ جس کی نسبت ذکر کیا جاتا ہے۔ اسے غائب کہتے ہیں۔

ضمائر کی حالتیں وہی ہوتی ہیں جو اسم کی ہیں (سوائے حالت خبری کے) ہر ایک کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

ضمائر متکلم

	واحد	جمع
فاعلی حالت	میں	ہم
مفعولی حالت	مجھے یا مجھ کو	ہمیں یا ہم کو
اضافی حالت	میرا	ہمارا
ظرفی حالت	مجھ میں	ہم میں
طوری حالت	مجھ سے	ہم سے

ضمائرمخاطب:

	واحد	جمع
فاعلی حالت	تو	تم
مفعولی حالت	تجھے یا تجھ کو	تمہیں یا تم کو
اضافی حالت	تیرا	تمہارا
ظرفی حالت	تجھ میں	تم میں
طوری حالت	تجھ سے	ہم سے

ضمائرغائب:

فاعلی حالت	وہ	وہ
مفعولی حالت	اسے یا اس کو	ان کو یا انہیں
اضافی حالت	اسے یا اس کو	ان کا
ظرفی حالت	اس میں	ان میں
طوری حالت	اس سے	ان سے

اردو ضمائر میں تذکیر و تانیث کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔

ضمائر غائب میں واحد اور جمع دونوں کے لئے (وہ) آتا ہے اور اس میں اشخاص اور اشیاء کا امتیاز نہیں ہوتا۔ پرانی اردو میں واحد کے لئے (وو) اور جمع کے لئے (وے) استعمال ہوتا تھا۔

(تو) بے تکلفی اور محبت کے لئے آتا ہے۔ جیسے ماں، بچے سے، گرو چیلے سے باتیں کرتا ہے۔ یا مخاطب کی کم حیثیتی کو ظاہر کرتا ہے۔ جیسے آقا نوکر سے باتیں کرتے وقت استعمال کرتا ہے۔

بعض اوقات بہت بے تکلف دوست بھی تو کہہ کر باتیں کرتے ہیں۔

نظم میں اکثر مخاطب کے لئے (تو) لکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے لوگوں اور بادشاہوں کو بھی اسی طرح خطاب کیا جاتا ہے۔

بعد شاہاں سلف کے تجھے یوں ہے تفصیل

جیسے قرآن پس توریت وزبور وانجیل (ذوقؔ)

دعا پر کروں ختم اب یہ قصیدہ

کہاں تک کہوں تو چنیں ہے چناں ہے (میر)

دعا مانگتے وقت خدا سے 'تو' سے خطاب کیا جاتا ہے۔ دوسرے مواقع پر واحد مخاطب کے لئے 'تم' ہی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ سوائے بے تکلفی کے موقع کے، تم بھی اکثر نوکروں اور چھوٹے لوگوں سے خطاب کرتے وقت بولا جاتا ہے۔ ورنہ اکثر اور عموماً واحد مخاطب اور جمع مخاطب دونوں کے لئے (آپ) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ آپ، تعظیماً واحد غائب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے اگر چہ لوگ طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے تھے، مگر آپ کو کبھی ملال نہ ہوتا۔ یا جب کوئی شخص کسی کو دوسرے سے ملاتا تو تعظیماً کہتا ہے کہ آپ فلاں شہر کے رئیس ہیں۔ آپ شاعر بھی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

(ہم) ضمیر متکلم جمع میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن بڑے لوگ بجائے واحد متکلم کے بھی استعمال کرتے ہیں۔ جیسے ہم نے جو حکم دیا تھا اس کی تعمیل کیوں نہیں کی گئی، نظم میں یہ تخصیص نہیں۔ واں اکثر واحد متکلم کے لئے بھی آتا ہے۔ جیسے:

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　بے نیازی تیری عادت ہی سہی

ایک ہم ہیں کہ دیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ　　ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

کبھی متکلم عمومیت کے خیال سے (ہم) استعمال کرتے ہیں۔ جیسے یہ چند روزہ صحبت غنیمت ہے ورنہ پھر ہم کہاں تم کہاں۔

ہماری قسمت ہی بری ہے جو کام کیا بگڑ گیا۔ وہ بڑے ضدی ہیں کسی کی کیوں ماننے لگے۔ آخر ہمیں کو دینا پڑے گا۔

بعض اوقات اس کا استعمال مبہم ہو جاتا ہے اور صحیح طور سے نہیں معلوم ہوتا ہے متکلم کے ساتھ کون شریک ہے۔ مثلاً کوئی کہئے ''میرا ساتھ کون دے گا۔'' اس کے جواب میں دوسرا شخص کہے۔ ''ہم سب تمہارا ساتھ دیں گے''۔ اگر یہ کہنے والا واحد ہے، مگر دوسروں کو بھی شریک کر لیتا ہے۔

بعض اوقات اس کے ساتھ دوسرے الفاظ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسے: ہم رعایائے سرکار، ہم شرکائے مجلس۔

کبھی کبھی محض انکسار کی غرض سے جب کہ اپنی شخصیت کا اظہار سننے والوں کے سامنے مناسب خیال نہیں کیا جاتا۔ گویا متکلم اپنی رائے یا فعل کو دوسروں کی آڑ میں چھپا لیتا ہے۔ جیسے ہماری رائے میں تعلیم کی اصلاح میں نہایت سرگرمی سے کوشش کرنی چاہئے۔

اس کا استعمال زیادہ تر اخباروں کے اڈیٹر کرتے ہیں جو گویا اہل ملک کے نائب ہیں۔

بعض اوقات یار اور یاروں کا لفظ واحد متکلم کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے: یار تو گوشۂ تنہائی میں رہتے ہیں، کہیں آئیں نہ جائیں۔ یاروں سے بچ کر کہاں جائے گا۔ یاروں کا لفظ واحد متکلم اور جمع متکلم دونوں کے لئے آتا ہے۔ مگر عموماً بے تکلفی کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ یہ

استعمال کسی قدر عامیانہ سمجھا جاتا ہے۔

کیا مدنظر تم کو ہے یاروں سے تو کہیے　　گر منھ سے کہتے اشاروں سے تو کہیے (ذوقؔ)

جب کسی جملے میں کوئی اسم یا ضمیر فاعلی حالت میں ہو اور وہی مفعول بھی واقع ہو تو بجائے ضمیر مفعولی کے آپ کو ''اپنے تئیں'' یا ''اپنے آپ'' کو استعمال کرتے ہیں جیسے احمد آپ کو دور کھینچتا ہے یا اپنے تئیں بڑا آدمی سمجھتا ہے۔ یا اپنے کو فاضل خیال کرتا ہے۔

اسی طرح جب کوئی اسم یا ضمیر کسی فقرے میں فاعل ہے اور اس کی اضافی حالت لانی منظور ہو تو بجائے اصل ضمیر اضافی کے اپنا، اپنی یا اپنے حسب موقع استعمال ہوں گے۔ جیسے: امجد اپنی حرکت سے باز نہیں آتا۔ تم اپنا کام کرو، مجھے اپنے کام سے فرصت نہیں۔ وہ خود تو چلے گئے مگر اپنا کام مجھ پر چھوڑ گئے۔ یہ اسی حالت میں جب کہ فاعل ایک ہو۔ اگر فاعل الگ الگ ہیں تو (اپنے) کی ضمیر نہیں آئے گی بلکہ جس ضمیر کا موقع ہوگا اس کی اضافی حالت لکھی جائے گی۔ جیسے: وہ تو چلے گئے مگر ان کا کام مجھ پر آ پڑا۔ یہاں چلے گئے کا فاعل ''وہ'' ہے۔ اور آ پڑا کا فاعل 'ان کا کام ہے۔' جیسے تم چلے گئے مگر تمہارا کام انہوں نے مجھے سونپ دیا کا فاعل انہوں نے۔

اپنا اور اپنی مضاف کے لحاظ سے حسب ترتیب واحد مذکر، واحد و جمع مؤنث اور جمع مذکر کے لئے آتے ہیں۔ اگر حروف ربط میں کوئی مضاف کے بعد آجاتا ہے۔ تو (اپنا) بدل کر (اپنے) ہو جاتا ہے۔ جیسے وہ اپنے کام سے غافل ہے۔ وہ اپنے ہوش میں نہیں۔

دراصل ایسے فقروں میں اصل ضمیریں اپنا، اپنی سے بدل گئی ہیں۔ مثلاً: مجھے اپنے کاموں سے فرصت۔ اصل میں تھا، مجھے میرے کاموں سے فرصت نہیں۔

آپ اور اپنا دوسرے ضمائر کے ساتھ تاکید کے لئے بھی آتا ہے۔ مثلاً: حالت فاعلی، میں آپ آ گیا تھا۔ وہ آپ آئے تھے، تم آپ گئے تھے، حالت اضافی میں جیسے میرا اپنا کام تھا۔ یہ ان کا اپنا باغ ہے۔

میرا اپنا جدا معاملہ ہے　　اور کے لین دین سے کیا کام (غالبؔ)

فارسی کا لفظ خود بھی (جس کے معنی آپ یا اپنے کے ہیں) انھیں معنوں میں آتا ہے۔

جیسے: انھوں نے خود فرمایا۔ خود بعض حالتوں میں زیادہ فصیح ہے اور خصوصاً حالت مفعولی میں۔ جیسے: میں نے خود اسے دیا۔ یہاں خود کے استعمال سے ابہام پایا جاتا ہے کے خود کا تعلق (میں) سے ہے یا (اسے) سے۔ لہٰذا اس کے رفع کے لئے ایسے موقعوں پر استعمال کی یہ صورت ہونی چاہئے کہ جس لفظ سے اس کا تعلق ہو اس کے اول استعمال کیا جائے مثلاً اگر یہاں خود کا تعلق (میں) سے ظاہر کرنا مقصود ہو تو یوں کہا جائے۔ ''خود میں نے اسے دیا'' مگر حالت اضافی میں خود کا کہنا فصیح نہیں ہے۔ ایسے موقعے پر (اپنا) زیادہ فصیح رہے گا۔ مثلاً: ''خود کا خود کرنا چاہئے۔'' کی بجائے ''اپنا کام آپ کرنا چاہئے''، زیادہ فصیح ہوگا۔

۲۔ضمیر موصولہ:

وہ ہے جو کسی اسم کے بجائے آتی ہے۔مگر اس کے ساتھ ہمیشہ ایک جملہ ہوتا ہے جس میں اس کے اسم کا بیان ہوتا ہے، جیسے وہ کتاب جو کل چوری گئی تھی، مل گئی۔آپ کے دوست جو چیچک رو ہیں مجھے ملے تھے۔ پہلے جملے میں 'جو' کتاب کے لئے اور دوسرے میں 'جو' دوست کے لئے۔اور ساتھ کے جملوں میں دونوں اسموں کا بیان ہے۔

ضمیر موصولہ صرف (جو) ہے، جس کی مختلف حالتیں یہ ہیں۔

	واحد	جمع
	جو، (حرف نے کے ساتھ)	جو، (حرف نے کے ساتھ)
فاعلی حالت	جس نے	جنہوں نے
مفعولی حالت	جس کو یا جسے	جن کو یا جنہیں
	(مذکر) جس کا	جن کا
اضافی حالت	(مونث) جس کی	جن کی
ظرفی حالت	جس میں	جن میں
طوری حالت	جس سے	جن سے

جن کو، جنہیں، جنہوں نے، جن کا، اگر چہ جمع ہیں مگر تعظیماً واحد کے لئے بھی آتے ہیں جس اسم کے لئے یہ ضمیر آتی ہے، اسے مرجع کہتے ہیں۔

ضمیر موصولہ ہمیشہ ایک جملے کے ساتھ آتی ہے اور دوسرا جملہ اس کے جواب میں ہوتا ہے۔مثلاً: وہ کتاب جو کل خریدی تھی جاتی رہی۔اس میں دو جملے ہیں۔ایک 'جو کل خریدی تھی' دوسرا وہ کتاب جاتی رہی'۔اس میں 'جو' ضمیر موصولہ ہے۔

(جو) حالت فاعلی میں واحد اور جمع دونوں میں یکساں استعمال ہوتا ہے مگر جب فاعل کے ساتھ 'نے' ہو تو واحد میں (جو) بھیس بدل کر (جس) اور جمع میں (جنہوں) ہو جاتا ہے۔مثلاً جس نے ایسا کیا برا کیا۔وہ لوگ جنہوں نے قصور کیا تھا معاف کر دیئے گئے۔

کبھی (جو) کے جواب میں فقرۂ ثانی میں (سو) آتا ہے۔جیسے جو ہو سو ہو۔جو چڑھے گا سو گرے گا۔

(جَون) بھی ہندی ضمیر موصولہ ہے مگر اردو میں (سا) کے ساتھ آتا ہے۔جیسے ان میں سے جَون سا چاہو لے لو۔جمع میں (جون سے) اور واحد و جمع مؤنث میں (جون سی) استعمال ہوتا ہے۔

کبھی (کہ) بطور ضمیر موصولہ کے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے۔

میں کہ آشوب جہاں سے تھا ستم دیدہ بہت　　امن کو سمجھا غنیمت دل غم دیدہ بہت (آزاد)

جو، جس اور جن بہ تکرار بھی آتے ہیں اور واحد یا جمع کی حالت میں ان کا اطلاق فرداً فرداً ہوتا ہے۔ مثلاً: جو جو پسند ہو لے لو۔ جن جن کے پاس گیا انہوں نے یہی جواب دیا۔

ضمائر استفہامیہ:

جو سوال پوچھنے کے لئے آتی ہیں دو ہیں۔ کون اور کیا (کون) جاندار کے لئے آتا ہے۔ (کیا) بے جان کے لئے۔

جیسے: کون کہتا ہے، کیا چاہئے۔

(کون) کی مختلف حالتیں یہ ہیں:

	واحد	جمع
فاعلی حالت	کون اور (نے کے ساتھ)	کون (نے کے ساتھ)
	کس نے	کنھوں نے
مفعولی حالت	کیسے یا کسی کو، کس سے،	کن کو یا کنھیں، کن سے
اضافی حالت	کس کا	کن کا
ظرفی حالت	کس میں	کن میں
طوری حالت	کس سے	کن سے

جیسے: کون کہتا ہے، کس نے کہا، کس کے پاس ہے، کس کو دیا؟ کن، اب صورت فاعلی میں کبھی ضمیر کے بجائے نہیں آتا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ آتا ہے۔ جیسے: کن لوگوں نے کہا؟

کس کس، کن کن اور کیا کیا بھی استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے: کس کس کو روؤں، کن کن سے کہوں، کیا کیا کروں۔

کون کون بھی بولتے ہیں جیسے وہاں کون کون تھے؟ ان فقروں میں فعل کئی اشخاص یا اشیاء پر فرداً فرداً واقع ہوتا ہے اور جمع کا ہونا بتاتا ہے۔

کون سا (کون سی، کون سے) بھی بجائے ضمیر مستعمل ہے۔ کون اور 'کون سا' میں فرق اتنا ہے کہ (کون سے) میں ذرا خصوصیت پائی جاتی ہے اور یہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کہ کئی چیزوں میں سے کسی ایک کا انتخاب مقصود ہو۔ مثلاً: ان میں سے کون سی چاہئے؟ یہاں

(کون) نہیں کہیں گے (سا) کے ساتھ (کون) اشخاص اور اشیاء دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

ضمائر اشارہ:

جو بطور اشارہ کے استعمال ہوتی ہیں ''وہ'' بعید کے لئے۔ ''یہ'' قریب کے لئے۔ ضمائر اشارہ اور ضمائر غائب شخصی ایک ہی ہیں۔ لیکن جب بطور اشارہ استعمال ہوتی ہیں تو انھیں ضمائر اشارہ کہتے ہیں۔ جیسے: وہ لوگ یا یہ۔ حروف ربط کے آنے سے وہ اُس سے اور یہ اس سے بدل جاتا ہے۔ اور جمع میں اُن اور ان ہو جاتا ہے۔

دین اور فقر تھے کبھی کچھ چیز　　اب دھرا کیا ہے اُس میں اور اس میں

ضمائر تنکیر:

وہ ہیں جو غیر معین اشخاص یا اشیاء کے لئے آئیں۔

ضمائر تنکیر دو ہیں، ''کوئی'' اور ''کچھ''

(کوئی) اشخاص کے لئے اور (کچھ) اشیاء کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کوئی ہے؟ کوئی نہیں بولتا۔ کچھ ہے یا نہیں؟ کچھ نہ کہو۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؟

حروف ربط کے آنے سے 'کوئی' کی صورت 'کسی' ہو جاتی ہے۔ جیسے: کسی کے پاس نہیں۔ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔

جب یہ ضمائر تکرار کے ساتھ کوئی کوئی اور کچھ کچھ استعمال ہوتے ہیں تو اس میں خاص زور پایا جاتا ہے۔ مگر معنی قلت کے آتے ہیں۔ جیسے: اب بھی کوئی کوئی نظر پڑ جاتا ہے۔

اگر چہ نایاب ہے مگر کسی کسی کے پاس اب بھی مل جاتی ہے۔ ابھی کچھ کچھ درد باقی ہے۔ نفی کے ساتھ بھی بہ تکرار آتا ہے۔ جیسے: ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا۔ کوئی نہ کوئی مل ہی رہے گا۔

عربی کے الفاظ 'بعض' اور 'بعضے' بھی ضمیر تنکیر کا کام دیتے ہیں۔ بعض کا یہ خیال ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں۔ ''بعض'' تکرار کے ساتھ بھی آتا ہے۔ جیسے بعض بعض ایسے بھی ہیں۔ اسی طرح 'فلاں'، 'کُل' اور 'چند' بھی بطور ضمیر تنکیر کے استعمال ہوتے ہیں۔

ضمائر تنکیری دوسرے ضمائر کے ساتھ مل کر مرکب بھی آتی ہیں جیسے جو کوئی، جو کچھ، جس کسی، ہر کوئی۔ جیسے: جس کسی کو کہتا ہوں وہ الٹا مجھی کو قائل کرتا ہے۔ جو کچھ کہو بجا ہے۔ ہر کوئی یہی کہتا ہے۔ جو کچھ ہے غنیمت ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔

غیر مشروح مطالعہ

کمال احمد

ایک تھا راجہ (ڈراما)

(کمال الدین احمد نام ولد شمس الدین احمد-کلکتہ میں ۱۹۴۷ء پیدا ہوئے۔تعلیم ایم۔اے اردو۔ملازمت الہ آباد بینک۔کمال احمد عہد حاضر میں اردو کے اہم ڈراما نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔انہوں نے ''ڈرامائی اداکاری مولانا آزاد کالج،کلکتہ کے اسٹیج سے شروع کی اور بہت جلد اس فن کے نکات سے واقفیت حاصل کر لی۔'' کمال احمد نے عہدِ حاضر کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال کی کج ادائیوں کو تمثیل کے پردے میں بے نقاب کرنا ہی اپنے ڈراموں کا محور قرار دے لیا ہے۔انیس رفیع کہتے ہیں کہ ''اُس کے ڈرامے عصری سچائیوں کی وہ تمثیل ہیں جنہیں دیکھ کر ناظرین کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔'' سلیم شہزاد کہتے ہیں کہ ''ایک تھا راجہ مختصر فنطاسیائی تمثیل Burlesque ہے۔'' اس تمثیل کے ذریعے انہوں نے عصر کی سماجی، معاشی اور سیاسی صورتِ حال کو فن کاری کے ساتھ Allegorise کیا ہے۔

کمال احمد کے ڈراموں میں سماجی ابتری پر شدید طنز نظر آتا ہے۔ان کے ڈراموں میں چُست مکالموں، حاضر جوابی کہیں کہیں مضحکہ خیز صورت حال اور عام فہم محاورے کے پردے میں ان کے پیغام کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔کمال احمد ڈراموں کے ہدایت کار بھی ہیں اور اداکار بھی۔انہوں نے اردو ڈراموں اور اردو اسٹیج کی ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ان کے ڈراموں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں دو ڈرامے تجرباتی، کشکول، مور کے پاؤں، پد یاترا، گھر کا بھیدی، گِرداب، اُلٹی گنگا اور پھندا ڈالنے والے مشہور ہیں۔)

کردار

راجہ، وزیر، بوڑھا کسان، نوجوان طالب علم، لیڈر، حاتم طائی، سند باد جہازی، پہلا درویش، دوسرا درویش، تیسرا اور رویش، چوتھا درویش، دو سپاہی، ایک سنتری، کچھ حاضرین دربار۔

(دربار لگا ہے، درباری بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔راجہ کا انتظار ہے۔ بگلی کی آواز آتی ہے اور ایک سنتری راجہ کی آمد کی اطلاع دیتا ہے)

سنتری: بے ادب، بے ملاحظہ، غافل رہو! راجہ راج گڑھ پرتاپ چندر پتر ہریش چندر تشریف لا رہے ہیں۔

راجہ داخل ہوتا ہے۔دبلا پتلا، کمزور لنگڑا کر چلتا ہوا تخت کی جانب بڑھتا ہے۔ بیٹھتے وقت لڑکھڑا جاتا ہے۔درباری مؤدبانہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔راجہ کے بیٹھ جانے پر درباری بھی بیٹھ جاتے ہیں۔پھر گفتگو میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ایک وزیر راجہ کے قریب آتا ہے یہ راجہ کا چہیتا وزیر ہے۔اسے دربار کے خاص امور میں کافی دخل ہے۔لمبا چوڑا، شکل سے کافی چالاک وہ راجہ کے قریب آ کر دائیں بازو کی طرف مئودبانہ کھڑا ہو جاتا ہے اور تالی بجا کر لوگوں سے خاموش رہنے کی اپیل کرتا ہے۔درباری خاموش ہو جاتے ہیں۔راجہ نہایت گمبھیر،

چپ چاپ تخت پر بیٹھا ہے۔آخر کار وزیر اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہتا ہے۔

وزیر: (ہاتھ جوڑ کر) جان کی اماں پاؤں تو کچھ عرض کروں مہاراج۔

(راجہ سر کے اشارے سے اجازت دے دیتا ہے۔اس کوشش میں اس کے سر سے تاج گرنے کو ہے۔وزیر بڑھ کر سنبھال لیتا ہے)

وزیر: ہمیں آپ کی یہ خاموشی مارے ڈال رہی ہے مہاراج! آخر کیا کارن ہے کہ آپ پچھلے پندرہ دنوں سے خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں، کچھ بولتے نہیں کچھ سنتے نہیں۔آخر ایسی کون سی پریشانی ہے جسے آپ ہم لوگوں سے چھپا رہے ہیں؟ آپ پچھلے پندرہ دنوں سے راج پاٹ کے کاموں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔مجھے تنہا سب کچھ دیکھنا پڑ رہا ہے۔کہیں آپ انٹلیکچوئل تو نہیں ہو گئے؟

(راجہ زوروں سے نفی میں سر ہلاتا ہے۔تاج پھر گرنے کو ہے کہ وزیر بڑھ کر سنبھالتا ہے)

وزیر: (گلوگیر لہجے میں) ایسا کون سا دکھ ہے جو ہمارے راجہ کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے؟ آپ نہیں جانتے آپ کے چپ سادھ لینے سے جنتا کتنی بے چین ہے۔رعایا پر کیا گزر رہی ہے۔

(درباری بھی کھڑے ہو کر لبیک کہتے ہیں)

درباری: (ایک زبان ہو کر) ہاں، ہاں، ہمیں بھی بتایئے آخر بات کیا ہے؟

(راجہ بدستور خاموش ہے، آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں)

وزیر: اے میرے آقا! آپ کی یہ دُردَشا اِن آنکھوں سے دیکھی نہیں جاتی۔پرائے ہم پر ہنستے ہیں، دشمن ہمارا مذاق اڑاتے ہیں، ملک کی عجیب حالت ہے۔ہفتوں گزر گئے۔نہ کوئی چوری ہوئی ہے اور نہ کہیں ڈاکہ پڑا ہے۔مسافر ہیں کہ مزے میں سفر کر رہے ہیں کوئی لوٹنے والا تک نہیں۔دو ہفتے سے جنتا پر کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا جا سکا۔حریف پارٹیاں ہیں کہ جلسے کرا رہی ہیں، جیسے واقعی گنٹر تنترا آ گیا ہو۔کوئی ان کے جلسوں میں ہڑبونگ کرنے والا نہیں۔کوئی ان کو جیل میں ڈالنے والا نہیں۔اندھیر ہے، مالک اندھیر ہے۔اگر آپ اس طرح کچھ دنوں اور خاموش رہ گئے تو ملک کا ستیاناس ہو جائے گا۔اتنی شانتی ٹھیک نہیں، کچھ تو کہیئے۔

راجہ: (خاموشی توڑتے ہوئے) میں نے خاموش رہنے کی قسم کھا رکھی ہے۔مگر اب جب کہ ملک کی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے اور عوام بے چین ہیں کہ میری خاموشی کا راز کیا ہے، تو مجھے مجبوراً اپنی یہ پندرہ روزہ خاموشی توڑنی پڑے گی۔

وزیر: (خوش ہو کر) دھن ہو مہاراج، دھن ہو!

(درباری بھی کھڑے ہو کر لبیک کہتے ہیں)

درباری: (ایک زبان ہو کر) دھن ہو مہاراج!

راجہ: (گلوگیر لہجے میں) مجھے کئی دنوں سے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ میرے یہاں اب تک کوئی سنتان نہیں ہوئی۔ آخر یہ راج پاٹ، یہ سلطنت، یہ شان وشوکت، اس کا وارث کون بنے گا؟ کون ہمارے بعد ہمارے باپ دادا کا نام روشن کرے گا؟ آخر اس راج کا وارث کب پیدا ہوگا؟ اب جبکہ میری عمر بھی چڑھ آئی ہے، کیا یہ چنتا جنک وشئے نہیں؟

وزیر: اوہ، یہ بات ہے مہاراج! اس میں اتنی چنتا کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے؟ ابھی سے اتنا نراش ہونے کی ضرورت نہیں۔

راجہ: پچھلے پانچ سال سے تم ہمیں یہی دلاسہ دیتے آئے ہو۔ لیکن اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کو ہے۔ اب میں یہ تخت وتاج، یہ راج پاٹ سب کچھ چھوڑ کر کسی جنگل بیابان میں نکل جاؤں گا یا کسی پہاڑ کی چوٹی پر ڈیرہ جمالوں گا۔ اب مجھ سے یہ راج پاٹ نہیں سنبھالا جاتا۔ اب میں سنیاس اختیار کرلوں گا۔

وزیر: (گھبرا کر) نہیں مہاراج نہیں! ایسا ظلم نہ کریں۔ ہماری رعایا کا سوچیں ان کا کیا ہوگا؟ انہیں کون سنبھالے گا؟

تمام درباری بھی کھڑے ہوکر کہتے ہیں

درباری: (ایک زبان ہوکر) ہاں مہاراج، ایسا نہیں ہوسکتا۔ آپ ہمیں چھوڑ کر نہیں جاسکتے!

وزیر: (کچھ سوچتے ہوئے) ایک اُپائے ہے مہاراج۔

راجہ: (اشتیاق سے) وہ کیا؟

وزیر: مہاراج میں آپ کی کئی ایسی اولادوں کو جانتا ہوں جو ملک کے وِبھن گھرانوں میں پل رہے ہیں۔ اگر آ گیا ہو تو ان میں سے ایک کو لے آؤں؟

راجہ: (غصے میں کھڑے ہوکر) نہیں، ہرگز نہیں۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے؟ میں جائز اولاد چاہتا ہوں۔ جو میری مہارانیوں کی کوکھ سے پیدا ہو، وہی اس سلطنت کا وارث ہوسکتا ہے ورنہ اور کوئی نہیں۔ ذرا سوچو اگر انہیں لے آئے تو جنتا پر اور پھر ہمارے پرکھوں کے اُس راج پر کیا اثر پڑے گا؟

وزیر: معافی چاہتا ہوں۔ آپ ایسا کریں ایک بیاہ اور کرلیں۔

راجہ: (مایوسی سے) اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ ہم نے سترہ بیاہ کئے۔ کوئی اولاد نہیں ہوئی تو ایک اور بیاہ سے کیا ہوگا۔ نہیں، مجھے ایسا لگتا ہے مجھ پر کسی کا شراپ ہے۔

وزیر: (چونکتے ہوئے) شراپ نہیں، مہاراج! ایسا نہیں ہوسکتا۔ آپ گھبرائیے نہیں۔ میں آج ہی ملک میں اعلان کئے دیتا ہوں کہ جو کوئی ہمارے راجہ کی اولاد کے لئے کوئی اُپائے، کوئی علاج یا مشورہ دے سکے اور کارآمد ہو تو اسے دس ہزار نقد انعام دیا جائے گا۔

راجہ: انعام کی رقم پانچ ہزار کرو، کیونکہ شاہی خزانے میں روپئے کم ہیں۔

وزیر: (ہاتھ جوڑ کر) اعلان دس ہی ہزار کرتے ہیں۔تبھی لوگ پرَیتن کریں گے۔رہی دینے کی بات تو وہ اپنے ہاتھ میں ہے۔

راجہ: (ڈر کے لہجے میں) ٹھیک ہے،ٹھیک ہے، جو بہتر سمجھو کرو۔

وزیر: مہاراج!اب آپ اپنا موڈ ٹھیک کرلیں تا کہ دربار کی باقاعدہ کاروائی شروع کی جاسکے

راجہ: (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) ٹھیک ہے،اب میرا موڈ قدرے بہتر ہے۔

وزیر: شکریہ مہاراج۔اب میں آپ کو یہ یاد دلانے کی کوشش کروں گا کہ آج مہاراج کا جنم دن ہے۔

درباری: (کھڑے ہوکر بیک زبان) مبارک ہو،جنم دن کی بدھائی ہو!

راجہ سرخم کر کے مبارکباد قبول کرتا ہے

وزیر: (با آواز بلند کہتا ہے) حاضرین دربار،آج راجہ،راج گڑھ شری پرتاپ چندر، پتر ہریش چندر کی 28 ویں سالگرہ ہم نہایت شاندار طریقے سے منائیں گے۔

راجہ: ہیں،آج پندرہ تاریخ ہے۔آج میرا جنم دن ہے اور مجھ کو ہی یاد نہیں۔ہاں،آج میرا جنم دن ہے (پھر گرج کر) لیکن یہ جنم دن 28 واں ہرگز نہیں بلکہ 25 واں ہے۔آپ لوگ آخر میری عمر بڑھانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟

درباری: (کھڑے ہوکر بیک زبان) عمر دراز ہو!ہمارے راجہ کی عمر دراز ہو!

راجہ: (غصہ سے) یہ ٹھیک ہے،لیکن ابھی میں ۲۸ ویں کا نہیں ہوا۔بلکہ میری عمر ۲۵ ویں میں داخل ہوئی ہے۔آخر میں نے اپنے یہ کیش خضاب سے سیاہ نہیں کئے ہیں۔

(دربار میں موت کی سی خاموشی طاری ہے)

وزیر: (کھنکارتے ہوئے) لیکن مہاراج،آ گیا ہو تو کچھ عرض کروں۔

(راجہ تمکنت سے سر کے اشارے سے اجازت دیتا ہے۔پھر تاج گرنے کو ہے،وزیر بڑھ کر سنبھال لیتا ہے)

وزیر: مہاراج! آپ کی یادداشت کچھ کمزور ہو چکی ہے۔پچھلے سال ہی آپ نے ۲۷ ویں سالگرہ منائی تھی اور.....

راجہ: (بات کاٹتے ہوئے) ہرگز نہیں!میں جو کہہ رہا ہوں اسے پتھر کی لکیر سمجھئے یہ میری ۲۵ ویں سالگرہ ہے۔

درباری: (کھڑے ہوکر بیک زبان) ٹھیک ہے،ٹھیک ہے۔تین برسوں میں کیا آتا جاتا ہے۔

ایک درباری:

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(راجہ خوش ہوکر سر سے موتیوں کی مالا اتار کر پھینکتا ہے

سب درباری اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں، مالا بکھر جاتی ہے، سب مل کر بانٹ لیتے ہیں)

وہی درباری: (احتجاج کرتے ہوئے) یہ کیا مہاراج، مالا تو آپ نے مجھے خوش ہوکر دی تھی۔ پھر یہ سب کیا؟ میرے ہاتھ ایک ہی موتی لگا؟

راجہ: آپ نہیں جانتے میرے دیش میں جمہوریت کا راج ہے۔ ڈیموکریسی کا راج۔ اس میں سبھوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

(درباری برا سا منہ بنا کر اپنی جگہ بیٹھ جاتا ہے)

وزیر: اس شبھ گھڑی کو امر بنانے کے لئے میں نے پچھلے ہفتے شہر میں منادی کرادی تھی کہ جو کوئی راجہ کو کسی طرح کا اُپہار دینا چاہے، وہ خود اُپہار لے کر دربار میں حاضر ہو۔ لہٰذا میں نے آج صبح سے ہی قلعہ کے باہر لوگوں کا اژدہام دیکھا ہے۔ یہ رات ہی سے قلعے کے باہر قطاروں میں کھڑے ہیں اور حسب توفیق اپنے راجہ کے لئے کچھ نہ کچھ لے کر راجہ سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ اب اگر مہاراج اجازت دیں تو انہیں اندر آنے کو کہوں۔

راجہ: (ہاتھ اٹھا کر) ٹھیک ہے۔ ایک ایک کر کے اندر لایا جائے۔ لیکن اندر آنے سے پہلے ان کی اچھی طرح تلاشی لے لی جائے۔ تم تو جانتے ہو بھیڑ دیکھ کر میں نروس ہو جاتا ہوں۔

(وزیر سنتری کو اشارہ کرتا ہے۔ وہ چلا جاتا ہے۔ کچھ لمحے بعد اسکے ہمراہ ایک فاقہ زدہ بوڑھا داخل ہوتا ہے، ننگے بدن، ننگے پاؤں، جھانگتی ہوئی پسلیاں اور دھنسی ہوئی آنکھیں، چاروں اور دربار کی شان وشوکت دیکھ کر مبہوت ہے)

راجہ: (غصے میں تخت سے اٹھ کر) یہ کیا؟ اس بوڑھے فقیر کو اندر آنے کی اجازت کس نے دی؟

وزیر: (سمجھاتے ہوئے) لیکن مہاراج، یہ فقیر نہیں، ہماری رعایا ہے اور اگلے سال ہی الیکشن ہونے والا ہے۔ اگر عوام کے دل نہ جیتے گئے تو حریف پارٹیاں ووٹ لے جائیں گی اور پھر یہ گدّی ہاتھ سے گئی سمجھئے۔

(راجہ کچھ نہیں کہتا۔ نفرت سے بوڑھے کو دیکھتے ہوئے ناک پر رومال رکھ لیتا ہے)

وزیر: مہاراج! یہ شخص کل رات سے لائن میں کھڑا ہے۔ اس کا اصرار ہے کہ وہ آپ سے ضرور مل کر جائے گا۔

راجہ: (نخوت سے) تم کیا لائے ہو میرے لئے اور تم مجھے کیا دے سکتے ہو؟

بوڑھا: (ہاتھ جوڑ کر) مہاراج! یہ سچ ہے میں آپ کو کچھ نہیں دے سکتا۔ میں ایک بوڑھا کسان آپ کو کیا دے سکتا ہوں۔ جو کچھ بھی

میرے پاس تھا، وہ سب آپ کو دے چکا ہوں۔ اب یہ چمڑی بچی ہے، اسے اپنی جوتی کے لئے استعمال کیجئے۔ بس یہی میرا آخری تحفہ ہے یہی میں آج دینے آیا ہوں۔

راجہ: (غصے میں لال پیلا ہوکر) بوڑھے نابکار، تیرا دماغ چل گیا ہے؟ میری جوتی کو تیرے بوڑھے چمڑے کی حاجت نہیں۔ البتہ میں تیری کھال ادھیڑوا کر اس میں بُھس بھروا سکتا ہوں۔

بوڑھا: (عاجزی سے) وہی کیجئے سرکار۔ بڑی مہربانی ہوگی۔ اب اور جیا نہیں جاتا۔ میں چاہتا ہوں کہ مر کر بھی آپ کے کام آؤں۔

(وزیر راجہ کے کان میں کچھ کہتا ہے، پھر کسان سے مخاطب ہوتا ہے)

وزیر: بوڑھے، تو کسان ہے، تجھے زندہ رہنا ہے۔ اگر تو زندہ نہیں رہے گا تو ہم کیسے زندہ رہیں گے؟ اگر تو کھیت نہیں جوتے گا، غلہ نہیں اُگائے گا تو ہم کیا کھائیں گے؟ ظاہر ہے ہم تو یہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہماری زندگی کی خاطر تجھے زندہ رہنا بہت ضروری ہے۔

بوڑھا: لیکن سرکار، اب میرے ہاتھ پاؤں میں اتنی طاقت نہیں کہ میں ہل جوت سکوں۔ بہت جلد تھک جاتا ہوں۔ دن بھر میں ایک چوتھائی کھیت بھی نہیں جوت سکتا تو میرا زندہ رہنا کس کام کا؟

راجہ: ہم کچھ نہیں سننا چاہتے۔ جا، وقت ضائع نہ کر۔ دن چڑھ آیا ہے کھیت کو جا۔

بوڑھا: کھیت جا کر کیا کروں، نہر سوکھی پڑی ہے۔ آبپاشی کا کوئی بندوبست نہیں، دوسرے گاؤں سے پانی لانے کے لئے الیکٹرک پمپ ضروری ہے اور اس کے لئے پیسے چاہئیں جو میرے پاس نہیں۔

راجہ: پیسے نہیں؟ تو بینک کیوں نہیں جاتے۔ آخر ہم نے بینک غریب کسانوں کے لئے ہی تو nationalise کیا ہے، تم وہاں جاؤ، روپے ضرور ملیں گے۔

بوڑھا: میں جا چکا ہوں، روپئے ملنے تو درکنار، میری جیب سے پندرہ روپے بھی چلے گئے۔

راجہ: (چونک کر) وہ کس طرح؟

بوڑھا: بینک کے کلرکوں کو دینے اور بڑے بابو تک پہنچنے میں؟

وزیر: پھر؟

بوڑھا: پھر کیا۔ سال بھر انہوں نے دوڑایا۔ میرا کھیت بڑے بابو نے آکر دیکھا اور گھوس مانگا۔ اب بتایئے، میں غریب کسان سو روپے کہاں سے لاتا۔ نتیجہ یہ ہوا ادھار نہیں ملا۔

وزیر: تو تم کسی جوت دار کے پاس اپنا بیل گروی کیوں نہیں رکھ دیتے؟

بوڑھا: سرکار، اگر بیل بھی گروی رکھ دوں تو ہل کیسے جوتوں اور مجھ بوڑھے میں اتنا دم نہیں کہ خود بیل کی جگہ لے لوں۔

راجہ: ٹھیک ہے، کیا تیرا کوئی لڑکا نہیں جس سے بیل کا کام لیا جا سکے؟

بوڑھا: (آنکھوں میں آنسو بھر کر) مہاراج! میرے تین جوان بیٹوں کو تو آپ نے فوج میں زبردستی بھرتی کر لیا اور ایک ایک کر کے یدھ میں مارے گئے۔

(سسکیاں بھرتا ہے)

وزیر: بھئی، وطن کی حفاظت کے لئے تو یہ ضروری ہے۔

بوڑھا: اور مہاراج، ان کے شہید ہونے کے بعد مجھ سے ماہانہ 50 روپئے وظیفہ کا وعدہ کیا تھا جو تین ماہ مل کر بند ہو گیا۔

وزیر: اوہ، وہ وظیفہ ہمیں مجبوراً بند کر دینا پڑا تھا۔ کیونکہ شاہی خزانے میں اب اتنا روپیہ نہیں کہ دیا جا سکے اور پھر تم کسان لوگ بھی مالگزاری باقاعدگی سے ادا نہیں کرتے۔

بوڑھا: کیسے کروں؟ پچھلے سیلاب میں فصل برباد ہو گئی اور اس سال قحط پڑنے کو ہے۔

وزیر: ہمیں تمہارے ساتھ ہمدردی ہے۔ ہم اپنے اگلے منصوبے میں تم کسانوں پر خرچ کے لئے بڑی رقم رکھیں گے۔

راجہ: بوڑھے، تمہارا اور کوئی نہیں اس دنیا میں؟

بوڑھا: تین لڑکوں کے علاوہ میری ایک بیٹی تھی روپا۔

راجہ: (آنکھیں چمک اٹھتی ہیں) روپا! اب وہ کہاں ہے؟

بوڑھا: سرکار، وہ تو آپ کے ہی محل میں ہے، آپ کے ہی لوگ ایک رات اسے چپکے سے سوتے میں اٹھا لائے تھے۔

راجہ: (نظریں چراتے ہوئے) اچھا، اچھا۔ وہ روپا تمہاری بیٹی ہے۔ خیر، بہت آرام سے ہے۔ فکر کی ضرورت نہیں، اس کے علاوہ کوئی؟

بوڑھا: مہاراج! میری بیوی برسوں پہلے ہیضے میں مر گئی، کیونکہ ان دنوں اسپتال میں ڈاکٹروں کی ہڑتال تھی اور میری ایک نو ماہ کی بچی کو اسی اسپتال میں چوہے کھا گئے۔

وزیر: چوہے کھا گئے؟ اوہاں ہمیں خبر ہے، تحقیق کی جا رہی ہے۔

بوڑھا: یہ تو برسوں پہلے کی بات ہے۔ اب تک تحقیق کی جا رہی ہے!

راجہ: ہاں بھئی سرکاری کام میں تو دیر ہوتی ہے۔ تمہارا اور کوئی نہیں؟

بوڑھا: (راجہ کے پاؤں پکڑتے ہوئے) بس ایک آپ ہیں۔ آپ ہی سب کچھ ہیں۔ اوپر بھگوان نیچے آپ۔ اور ہم تو آپ کو ہی بھگوان سمجھتے ہیں۔ اب اگر آپ ہی ہمارے نہ ہوں گے تو اور کون ہو گا؟

راجہ: (غصے میں کھڑا ہو جاتا ہے) نہیں، ہم صرف تمہارے نہیں۔ ہم پچاس کروڑ عوام کے ہیں۔ ان پچاس کروڑ عوام کے جو ہم پر آس

لگائے بیٹھے ہیں کہ غریبی کب ہٹے گی، دکھ کے بادل کب چھٹیں گے معصوم بھولے بھالے عوام! یہ آس ہم توڑنا نہیں چاہتے۔

بوڑھا: لیکن مہاراج، آخر یہ غریبی کب ہٹے گی؟

راجہ: (پرامید لہجے میں) بہت جلد۔ یہ آسان کام نہیں جو منٹوں میں ہو جائے۔ اس کے لئے ہمیں صبر کرنا ہوگا۔ ہم پر بھروسہ رکھنا ہوگا۔ ایک بار اور ہمیں راجہ بنانا ہوگا۔ ایک بار اور اس الیکشن میں ہمیں کامیاب کرو۔ پھر دیکھنا تمہارے دکھ درد کے دن دور ہو جائیں گے۔

بوڑھا: (سرد آہ بھر کر) مہاراج! تب تک شاید میں نہ رہوں۔ خیر، آج اس مبارک دن میں میں آپ سے کچھ مانگ سکتا ہوں؟

وزیر: مانگنے کی طرح مانگ ورنہ.....

بوڑھا: مہاراج مجھے اپنی بیٹی روپا سے ملنے کی اجازت دیں۔ اسے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔

راجہ: ہرگز نہیں!

بوڑھا: صرف ایک بار!

راجہ: (سنتریوں سے) لے جاؤ اس بوڑھے کو۔ اس کا دماغ چل گیا ہے۔

دو سنتری بوڑھے کو بازوؤں سے کس کر پکڑ لیتے ہیں۔ وہ اپنے کو چھڑانا چاہتا ہے، لیکن وہ اسے گھسیٹتے ہوئے لے جاتے ہیں۔ بوڑھا چلاتا ہے۔

بوڑھا: مجھے اپنی بیٹی سے ملنے دو، صرف ایک بار!

راجہ: (تلملاتے ہوئے) کم بخت نے سارا موڈ خراب کر دیا۔

(وزیر سنتری کو پھر اشارہ کرتا ہے۔ وہ چلا جاتا ہے، پھر ایک نوجوان کے ہمراہ داخل ہوتا ہے۔ کرتے پاجامے میں ملبوس۔ پھر کندھے سے تھیلا لٹک رہا ہے۔ نوجوان باغیانہ انداز میں داخل ہوتا ہے)

وزیر: نوجوان! تم راجہ کے جنم دن پر کون سا تحفہ لائے ہو؟

نوجوان: میں چند خواب لے کر آیا ہوں، چند سپنے۔

راجہ: صرف خواب؟ سپنے؟ لیکن ہم تمہارے خواب لے کر کیا کریں گے؟ ہم اپنی خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ ہم دوسروں کے سپنے نہیں لیتے۔

نوجوان: مہاراج یہ خواب، یہ سپنے آج ملک کا ہر نوجوان دیکھ رہا ہے۔

راجہ: (بے پروائی سے) دیکھتا ہوگا، ہم کو اس سے کیا مطلب۔

نوجوان: لیکن مہاراج، ان خوابوں کی تعبیر آپ سے وابستہ ہے۔ آج ملک کا نوجوان گریجویٹ یا ایم اے ہو جانے کے بعد بھی بے کار

ہے۔وہ جواس نے ایک سنہرا سپنا دیکھا تھا،نوکری،خوشحالی اور ترقی کا، وہ سب اب بکھرنے کو ہے۔اس کے تمام راستے بند ہیں۔اس کے آگے اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا ہے۔آخر وہ کیا کرے؟

راجہ: سپنا؟ ہاہاہا! انہیں سپنے ہی دیکھنے دو۔

وزیر: (راجہ سے) آہستہ۔کہیں اُن کی نیند نہ ٹوٹ جائے۔(پھر نوجوان سے) ہاں نوجوان،تم لوگ خوش قسمت ہو کہ سپنے دیکھ لیتے ہو۔ یہاں ہماری تو فکر سے نیند ہی اڑ گئی ہے۔برسوں سے سو نہیں پائے۔آخر اس مسئلے کو کس طرح حل کیا جائے؟

نوجوان: اب اور زیادہ دن انتظار نہیں کیا جا سکتا۔آپ ہماری بے کاری دور کریں۔آخر یہ نوجوان پڑھ لکھ کر کیا کریں۔فاقہ کر کے مر جائیں یا چوری ڈکیتی پر تل جائیں؟ بتایئے!

راجہ: (غصے سے) نوجوان! زبان کو لگام دو۔تم بھول رہے ہو کہ کس سے مخاطب ہو؟

نوجوان: لیکن مہاراج، یہ بولنے کا ادھیکار بھی تو آپ نے ہی ہمیں انگریزوں سے دلایا ہے۔گنڑتنتر کا پتھ بھی آپ نے ہی دکھایا ہے۔

راجہ: ٹھیک ہے، ہم نے ایسا ضرور کیا ہے۔لیکن اس کی بھی ہم نے ایک سیما بنا رکھی ہے اور اس سیما کو توڑنے والوں کے لئے قوانین کا جال بچھا رکھا ہے۔

نوجوان: تلخ نوائی کی معافی چاہوں گا۔مگر آج آپ سے بہت کچھ کہنا ہے۔

راجہ: تم نے شاید بہت زیادہ کتابیں پڑھ لی ہیں، اسی لئے اوٹ پٹانگ ہانک رہے ہو۔اب ہمیں ایجوکیشن سسٹم ہی بدلنا ہوگا۔کورس کی کتابیں تبدیل کرنی ہوں گی (تشویش سے) ورنہ ہمارے نوجوان imported لٹریچر پڑھ پڑھ کر برباد ہو جائیں گے۔

نوجوان: ہمارا ایجوکیشن سسٹم تو ویسے بھی ایک Farce ہے۔کالجوں اور یونیورسٹیوں میں امتحانات نہیں ہوتے۔تین سال کا کورس چھ سال میں پورا ہوتا ہے، تاکہ پڑھے لکھے نوجوانوں کی سنکھیا کم ہو۔امتحان میں نقل کی کھلے عام اجازت ہے، تاکہ یہ طلبا اپنی صلاحیت کھو بیٹھیں۔میں خوب سمجھتا ہوں ان چالوں کو، اب ہم طلبا جاگ رہے ہیں۔

راجہ: (غصے میں کانپتے ہوئے تالی بجا کر) داروغہ زنداں لے جاؤ اس باغی کو اور ڈال دو کالی کوٹھری میں۔دو دن میں دماغ ٹھکانے آ جائیں گے۔

(دو سنتری نوجوان کو گرفت میں لے لیتے ہیں۔نوجوان چلاتا ہے)

نوجوان: آپ پچھتائیں گے۔میں اسٹوڈنٹ لیڈر ہوں۔الیکشن قریب ہے، ملک کے ڈیڑھ لاکھ اسٹوڈنٹ میرے ساتھ ہیں۔میری نظر بندی کے خلاف زبردست آندولن چلائیں گے وہ۔آپ کا یہ تخت و تاج خطرے میں پڑ جائے گا۔

(وزیر راجہ کے کان میں کچھ کہتا ہے۔راجہ ہاتھ کے اشارے سے سنتریوں کو چھوڑ دینے کو کہتا ہے)

راجہ: (نرم پڑتے ہوئے) نوجوان! ہم اہنسا کے پجاری ہیں۔ ہم گاندھی جی کے ماننے والوں میں ہیں۔ پھر تمہارے اندر یہ مار دھاڑ کے وچار کہاں سے آ گئے؟ شانتی اور دھیرج سے کام لو نوجوان۔ یہ وہ سمسیا ہے جس کا سامادھان اتنا آسان نہیں۔ دماغ گرم کر کے حل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے ہمیں گمبھیرتا سے سوچنا ہوگا۔ ہم اس سلسلے میں بہت جلد نوجوانوں سے ملیں گے۔ اُن کی شکایتیں سنیں گے۔ اس کے لئے ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ کیا ایسے آڑے وقت میں تم ہمارا ساتھ نہیں دو گے؟

نوجوان: ہم بات چین کیلئے تیار ہیں۔ مگر صرف یوجنا بنانے سے کام نہیں چلے گا۔ اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

راجہ: ضرور، ضرور (پھر گلے سے ہار نکال کر پھینکتے ہوئے) لو یہ تمہارا انعام۔

نوجوان: (پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے) یہ انعام کس لئے مہاراج؟

وزیر: یہ انعام تمہیں اس بات کا دیا گیا ہے آج تم نے ایک گمبھیر سمسیے کی اور دھیان دلایا ہے۔

راجہ: اور ہم ساتھ ہی ساتھ تمہیں پچاس بیگھہ زمین الاٹ کرتے ہیں۔

نوجوان: (آنکھیں پھاڑ کر) پچاس بیگھہ زمین؟ وہ کس لئے مہاراج؟

وزیر: اس زمین کے ایک حصے میں بے کار نوجوانوں کے لئے ایک شاندار بلڈنگ بناؤ اور اس میں ایک کلب استھاپت کرو، تاکہ بے کاری کا سمے وہ وہاں بتا سکیں۔ وہ ان کے سپنوں کا محل ہوگا اور بقیہ زمین تم اپنے نام کر لو۔ اور ہاں ہم سالانہ پچاس ہزار روپئے اس کلب کے خرچ کے لئے مقرر کرتے ہیں۔

نوجوان: (خوشی سے بے قابو ہو کر) دھن ہو مہاراج، دھن ہو (پھر کچھ یاد کر کے) لیکن مہاراج، اگر دوسرے نوجوانوں کو یہ فیصلہ پسند نہ آیا اور انہوں نے مجھ پر غداری کا الزام لگایا تو میں کیا کروں گا، مہاراج؟

راجہ: (کمر سے خنجر نکال کر دیتے ہوئے) لو! یہ تمہاری حفاظت کرے گا۔

نوجوان: (خنجر کو آنکھوں سے لگاتا ہے پھر تشویش سے پوچھتا ہے) لیکن مہاراج! اگر تھانے دار.....؟

وزیر: ہم تمہارے ساتھ ہیں، جوان، چنتا کی کوئی بات نہیں۔

نوجوان: (خوشی میں جھوم کر) راجہ پرتاپ جگ جگ جیو!

(چلا جاتا ہے)

راجہ: (وزیر سے) جنم دن منانے کا یہ خوب طریقہ نکالا ہے کہ مجھے رعایا کے سامنے جواب وہ ہونا پڑا۔

وزیر: (ہاتھ جوڑ کر) غلطی ہوگئی سرکار۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ ایسے لوگ آ جائیں گے۔ لیکن مہاراج، اس سے ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ آپ کو جنتا کی بھاؤناؤں کا پتہ چل گیا۔

راجہ: (بگڑ کر) ہمیں سب پتہ ہے، لیکن ہمیں ان کی بھاؤ ناؤں سے کوئی مطلب نہیں۔ اگر ہم یہ فکر کرنے لگیں تو پھر حکومت کون کرے۔

وزیر: (ڈر کر) شما کریں مہاراج بھول ہوگئی۔

راجہ: (تمکنت سے) آئندہ اس کا خیال رکھا جائے ورنہ ہم یہ سمجھیں گے کہ تم بھی ہمارے وفادار نہ رہے۔

وزیر: (گڑگڑاتے ہوئے) نہیں مہاراج، میں مرتے دم تک آپ کا وفادار رہوں گا۔

راجہ: ٹھیک ہے، اس میں تمہاری بھلائی ہے۔

وزیر: (سنتری سے) باہر لوگوں سے کہہ دو کہ بھینٹ سویکار کئے جا چکے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔

(سنتری چلا جاتا ہے، پھر واپس آتا ہے)

سنتری: : مہاراج! سب چلے گئے ہیں، لیکن ایک شخص کا اصرار ہے کہ وہ آپ سے مل کر ہی جائے گا۔ ورنہ قلعہ کے باہر مرن برت رکھ لے گا۔

راجہ: (غصے میں) مرن برت رکھنے دو، مرنے دو کم بخت کو، کچھ تو غلہ بچے گا۔

(وزیر راجہ کو کچھ سمجھاتا ہے اور سنتری سے کہتا ہے)

وزیر: لے آؤ اسے۔

(سنتری کے ساتھ ایک شخص داخل ہوتا ہے)

راجہ: تم کون ہو؟ ہمیں کیا دینے آئے ہو؟

نو وارد: میں مزدوروں کا لیڈر ہوں۔ ان مزدوروں کا جو ملوں اور کارخانوں میں اپنا خون پسینہ بہا کر بھی دو وقت کی روٹی نہیں پاتے۔ آج ان ہی مزدوروں کی فریاد لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔

راجہ: بکواس بند کرو۔ مزدور کارخانوں میں کام نہیں کرتے۔ پیداوار دن بدن گرتی جا رہی ہے۔ اسی کارن ہمیں بدیشی مدرا نہیں ملتا۔ حکومت کس طرح چلائیں گے بدیشی مدرا کے بنا۔ تم ان مزدوروں کی فریاد لے کر آئے ہو!

لیڈر: اگر پروڈکشن کم ہوتا ہے تو اس کا ذمہ دار مزدور نہیں، کارخانے کا مالک ہے۔ حکومت ہے، جو کچا مال سپلائی نہیں کرتی۔ اگر آپ سے حکومت نہیں چلتی تو آپ اس سے الگ کیوں نہیں ہو جاتے؟

راجہ: (بپھر کر) خاموش یہ ہماری مرضی پر ہے۔ چھوڑیں یا نہ چھوڑیں، تم ہمیں سبق دینے والے کون ہوتے ہو؟

وزیر: (راجہ کے کان میں کچھ کہتا ہے پھر لیڈر سے مخاطب ہوتا ہے) ہم مزدوروں کی مانگوں پر غور کریں گے۔ ان کے اچھے سروس کنڈیشن کے لئے ہم نے کئی منصوبے بنائے ہیں۔ ان پر بہت جلد عمل کیا جائے گا۔

لیڈر: یہ سنتے سنتے کان پک گئے۔کارخانے تالا بندی کے شکار ہوتے جارہے ہیں۔نیا کارخانہ کھلتا نہیں۔جو پرانی بڑی بڑی انڈسٹریاں ہیں،ان میں بدیشی انجینئر اور ماہرین کام کررہے ہیں جب کہ ہمارے ملک میں انجینئر بے کار ہیں۔

وزیر: یہ ٹھیک ہے۔مگر یہ انڈسٹری بدیشی ملکوں کی مدد سے قائم کی گئی ہے۔اس لئے ہمیں ان کے انجینئر اور ماہرین کو رکھنا پڑتا ہے۔ (سمجھاتے ہوئے)اس سے ہمارا ملک سخت کٹھنائیوں سے دوچار ہے۔قحط پڑ گیا ہے۔شاہی خزانہ خالی ہے۔سرحد پر دشمن کی فوج جمع ہے۔ ایسے مشکل وقت پر ہمیں اپنے راجہ کا ساتھ دینا چاہئے۔مل جل کر ان مسئلوں پر غور کرنا چاہئے۔جایئے مزدوروں اور ورکروں کو سمجھایئے کہ اپنے اپنے کام پر واپس جائیں اور پروڈکشن بڑھائیں۔جبھی ہم ترقی کر سکتے ہیں۔

لیڈر: مگر ہمارے مزدوروں کی جو جائز مانگ ہے اس کا کیا ہوگا؟

وزیر: آپ ان سے کہہ دیں بات چیت ہورہی ہے۔اس دوران ہم ملک میں ایمرجنسی لاگو کردیتے ہیں اور ہڑتال وغیرہ غیر قانونی قرار دے دیتے ہیں۔

لیڈر: مگر یہ سراسر ظلم ہے۔

راجہ: ظلم نہیں،ملک کی ضرورت کے عین مطابق ہے اور پھر تمہیں فکر کس بات کی ہم تمہیں امریکہ کا سفیر بنادیں گے۔

لیڈر: آپ مجھے رشوت دے رہے ہیں؟

راجہ: یہ رشوت نہیں تمہاری خدمت کا صلہ ہے۔جاؤ اسٹرائک توڑ دو۔

(لیڈر نکل جاتا ہے،راجہ پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہے۔تاج ایک بار پھر گرنے کو ہے کہ وزیر سنبھال لیتا ہے)

وزیر: (راجہ سے)مہاراج کی اگر آگیا ہو تو ہم دربار کی کارروائی شروع کریں۔راجہ سر ہلا کر اجازت دیتا ہے۔

وزیر: حسب معمول سب سے پہلے اپرادھیوں کو باری باری راجہ کے حضور میں پیش کیا جاتا ہے۔چشم دید گواہوں کے بیان کی روشنی میں ان پر جو الزامات لگائے گئے ہیں،وہ بیان کرتا ہوں۔آج سب سے پہلے مجرم حاتم طائی کو حاضر کیا جائے۔

(ایک سپاہی آواز لگاتا ہے کہ حاتم طائی حاضر ہو۔حاتم طائی ایک سنتری کے ہمراہ داخل ہوتا ہے۔عربی لباس میں لمبا چوڑا خوبصورت نوجوان ہے۔دربار کے وسط میں آکر کھڑا ہوتا ہے اور سر کو خم کر کے راجہ کو سلام کرتا ہے۔)

وزیر: (الزام پڑھتے ہوئے)حاتم طائی،ساکن بغداد شریف۔ہمارے وطن میں چھ برس ہوئے وارد ہوا۔مہاراج کی اجازت سے یہاں قیام کیا اور اس کی شہریت اختیار کی۔یہ شخص کہتے ہیں بڑا دریا دل بلکہ سمندر دل ہے۔اس کے دل میں دنیا بھر کا درد سمایا ہوا ہے۔اس کی صحت شہر کے اندیشے میں کافی اچھی ہوگئی ہے۔مہاراج،یہ وہ شخص ہے جو بھوکوں کو کھلاتا ہے اور ننگوں کو پہناتا ہے۔اس کی سخاوت کے

چرچے بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں اور یہ آہستہ آہستہ اپنی چالاکی وعیاری سے عوام میں ہر دلعزیز ہوتا جا رہا ہے۔ اگر اس شخص کو باز نہ رکھا گیا، سزا دی نہ گئی تو یہ شخص آپ کی سلطنت الٹ دے گا اور اگلے الیکشن میں لوگ اسے اپنا راجہ بنالیں گے۔

حاتم: (اپنا منہ پیٹتے ہوئے) توبہ توبہ ہرگز نہیں۔ مہاراج! میری ایسی کوئی تمنا نہیں۔ مجھے راج پاٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو ٹھہرا صوفی منش اور فقیر انسان۔ مجھے حکومت سے کیا لینا۔ میرے خلاف لگائے ہوئے الزامات پورے صحیح نہیں، مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ اگر ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کر دینا محتاجوں کی حاجت روائی کرنا آپ کے یہاں جرم ہے تو میں بے شک مجرم ہوں۔

راجہ: (وزیر سے) آگے بڑھو!

وزیر: یہ وہ شخص ہے جو خود بھوکا رہ کر اوروں کو کھلاتا ہے۔

راجہ: کیوں حاتم؟ کیا تمہیں بھوک نہیں لگتی؟

حاتم: (ہاتھ جوڑ کر) بھوک کیا خاک لگے مہاراج! جب ہر طرف بھوک ہی بھوک ہو۔ دوسروں کو بھوکا دیکھ کر مجھ سے کھایا نہیں جاتا۔

راجہ: (غصے میں کھڑے ہو کر) تم ہمیں غصہ دلا رہے ہو۔ یہ جنتا ازلی بھوکی ہے۔ اس کی بھوک کبھی نہیں مٹے گی۔

حاتم: مٹے گی سرکار۔ اگر ہم سب اپنے نوالے بانٹ لیں۔

راجہ: خاموش! چھوٹا منہ، بڑا نوالہ! مجھے سبق پڑھانے کی کوشش نہ کرو۔ حاتم کہیں تم کمیونسٹ تو نہیں ہو گئے؟

حاتم: (حیرت سے) کمیونسٹ؟ یہ کیا ہوتا ہے؟

راجہ: تم کمیونزم نہیں سمجھتے ہو تو پھر دریا دلی کیا معنی رکھتی ہے؟ تمہارے من میں غریبوں کے لئے اتنا پریم کیوں؟

وزیر: (آگے بڑھتے ہوئے) پرسوں ہی اس نے بھولا مستری کی لڑکی کی شادی کے لئے ۵۰۰ سو روپے دیئے، جب کہ بھولا ہمارے دربار سے خالی لوٹا تھا۔ اس طرح مہاراج، یہ شخص آپ کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

راجہ: (غصہ سے) تمہاری سخاوت حد سے بڑھتی جا رہی ہے۔ تم ہمیں رسوا اور ذلیل کر رہے ہو۔

حاتم: (ہاتھ جوڑ کر) مہاراج اگر بھولے کو روپئے نہ ملتے تو لڑکے والے بارات واپس لے جاتے۔ پھر، کہئے سرکار، رکمنی سے کون بیاہ کرتا؟

راجہ: تمہیں اس کی چنتا کی ضرورت نہیں۔ ہم جو ہیں۔ یاد رکھو تم دوسرے ملک سے آئے ہو۔ تمہیں ہمارے ملک کے قانون کے مطابق چلنا پڑے گا۔ ورنہ ہم تمہیں دی ہوئی شہریت واپس لے لیں گے۔ آئندہ خیال رہے۔ تمہیں جو کچھ مدد کرنی ہو، ہمارے قائم کردہ ٹرسٹ میں دینا۔ ہم لوگوں تک پہنچا دیں گے۔ اب تم جا سکتے ہو۔

(حاتم چلا جاتا ہے)

وزیر: اور یہ دوسرا ملزم ہے سِند باد جہازی۔

سپاہی: (آواز لگاتا ہے) سِند باد جہازی!

(ایک سپاہی کے ہمراہ سند باد جہازی حاضر ہوتا ہے۔ سفید پینٹ اور سفید قمیص، چھوٹی سی داڑھی، بغل میں بڑا سا پتوار لئے، سینہ تانے کھڑا ہے۔ سپاہی اسے سر جھکا کر سلام کرنے کو کہتے ہیں، مگر وہ بدستور اکڑا رہتا ہے۔ ایک سپاہی زبردستی اس کی گردن پکڑ کر جھکا دیتا ہے۔ وہ جھلّا کر مارنے اٹھتا ہے۔)

وزیر: (ڈانٹتے ہوئے) اکڑ نہیں چلے گی۔ تمیز سے کھڑے رہو۔ (پھر بڑھتے ہوئے) یہ شخص جو اپنا نام سند باد جہازی بتاتا ہے، کل رات ہُگلی ندی کے کنارے مشتبہ حالت میں گرفتار کیا گیا ہے۔ ہمیں شبہ ہے کہ یہ کوئی سی آئی اے ایجنٹ ہے یا پھر پڑوس کے دشمن ملک کا جاسوس۔

راجہ: کیوں؟ تم کون ہو؟

سند باد: میں ایک سیاح ہوں۔ سیاحت میرا کام ہے۔ میں نے دنیا کے تمام ملک دیکھے ہیں۔ میں نے اپنی کشتی میں پوری دنیا کی سیر کی ہے۔

راجہ: کیا تم ایسے پہلے بھی کبھی ہمارے ملک آئے تھے؟

سند باد: نہیں مگر میرا باپ آیا تھا۔ اور اُس نے اپنی ڈائری میں جو کچھ اس ملک کے بارے میں لکھا ہے، وہ میرا اشتیاق بھڑکانے کے لئے کافی ہے۔ اور اسی لیے میں نے ہندوستان کے سفر کی ٹھانی۔ مگر آہ! مجھے کیا پتہ تھا، میرا باپ جھوٹا ہوگا۔ وہ تمام باتیں غلط لکھے گا۔

راجہ: کیا لکھا تھا تمہارے باپ نے؟

سند باد: اس نے لکھا تھا، ہندوستان ایک شانت، وشال جگہ ہے جہاں روحانی سکون ملتا ہے۔ جہاں انصاف ہے، جنتا سنتوشت ہے۔ کوئی بھوکا نہیں، ننگا نہیں۔ اور اس نے ہرش وردھن اور اشوک کی خاص تعریف کی ہے۔

راجہ: تمہارے باپ نے پرانے ہندوستان کا ذکر کیا ہے جب یہاں بادشاہت تھی۔ لیکن آج کا ہندوستان کافی بدل گیا ہے، اب عوام کی حکومت ہے ڈیموکریسی ہے۔

سند باد: (قہقہہ لگاتا ہے) ڈیموکریسی، جمہوریت۔ ہاہاہا، یہ تو خاندانی جمہوریت ہے۔

وزیر: (غصے سے) سند باد، یہ ہمارا اندرونی معاملہ ہے۔ تم ہمارے نجی معاملات میں دخل نہ دو (پھر بڑھتے ہوئے) تلاشی لینے کے بعد اس کے پاس سے ہمارے خفیہ فوجی اڈے، سائنسی اداروں کی تصویریں ملی ہیں اور حکومت کے چند اہم دستاویزات کی نقل بھی ملی ہے۔

راجہ: یہ سب کیا ہے؟ تم یہاں جاسوسی کر رہے ہو؟

سند باد: (لاپروائی سے) یہ تصویریں، یہ دستاویزات میں نے روپے خرچ کر کے حاصل کئے ہیں، آپ کے ہی لوگوں سے منہ مانگے دام پر خریدا ہے۔ اس میں میرا کیا قصور۔

راجہ: لیکن یہ جرم ہے، ہم تمہیں سزا دے سکتے ہیں۔ جیل میں سڑا سکتے ہیں۔ جلاوطن کر سکتے ہیں۔

سند باد: (ہنستے ہوئے) جلاوطن؟ ہاہاہا! راجہ شاید بھول رہے ہیں کہ یہ میرا وطن نہیں۔

راجہ: افسوس، ہمارے ہاتھ بندھے ہیں۔ ہم تم سیاحوں کو، مشینری والوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اس سے ہماری فارن پالیسی خراب ہوگی۔ ڈالر نہیں ملے گا۔ ہم تمہیں لیکن وارننگ دیتے ہیں۔ اس کے بعد مسلسل دس وارننگ اور دیں گے۔ اگر اس پر بھی تم باز نہیں آئے تو تمہیں مجبوراً ہندوستان چھوڑنا پڑے گا۔ اب تم جا سکتے۔

(سند باد لاپروائی سے نکل جاتا ہے)

وزیر: یہ آپ نے کیا کیا؟ اسے یوں ہی چھوڑ دیا۔ یہ ملک کی سلامتی کے لئے خطرہ ہے۔

راجہ: کیا کروں، اس کے ملک سے جھگڑا نہیں مول لے سکتا۔

وزیر: پھر بھی یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ آپ دوسرے ملک سے مدد لے سکتے ہیں۔ دوسری بڑی طاقت سے جو اس کا منہ توڑ جواب دیتی ہے۔

(راجہ کچھ جواب نہیں دیتا)

وزیر: اور یہ ہیں چار درویش جنہیں کل رات کے تین بجے ایک باغ سے گرفتار کیا گیا ہے۔ یہ چاروں اتنی رات گئے سیکشن 144 کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پائے گئے تھے۔

سپاہی: چار درویش، چاروں حاضر ہوں۔

(ایک سپاہی چار درویشوں کو لے کر داخل ہوتا ہے)

راجہ: آپ لوگ کون ہیں؟ اتنی رات گئے باغ میں کیا کر رہے تھے؟

چاروں: (بہ یک زبان) ہم سب چاروں درویش ہیں۔

راجہ: تم میں سے ایک کہے۔

ایک: مہاراج ہم سب دنیا کی چار سمتوں مغرب، مشرق، شمال اور جنوب سے آئے ہیں بلکہ بھیجے گئے ہیں۔

راجہ: (حیرت سے) بھیجے گئے ہیں؟ وہ کس طرح؟

دوسرا: ہمیں ایک بزرگ نے یہاں بھیجا ہے۔

راجہ: کون ہیں وہ بزرگ؟

تیسرا: انہوں نے اپنا نام، وقت بتایا ہے

راجہ: وقت؟ یعنی سمے؟

چوتھا: :جی ہاں، وہ ہم چاروں سے باری باری ملے اور تلقین کی ہندوستان کا رخ کر۔ وہاں تجھے تیری مراد ملے گی، تیرے بے قرار دل کو قرار آئے گا۔ چنانچہ ہم سب کل رات باغ میں جمع ہوئے، ایک دوسرے کو آپ بیتی سنا رہے تھے کہ آپ کا یہ بے وقوف ناہنجار سپاہی ہمیں پکڑ لایا۔

راجہ: یہ تو اس کا فرض تھا۔ تم ہمارے ملک میں نئے نئے آئے ہو، اس لئے ہمارے ملک کے قانون سے واقفیت نہیں۔ ہمارے یہاں رات کے 12 بجے کے بعد اسمگلروں کے سوا دوسرے گھومنے والوں کو گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں دفعہ 144 لگی ہے۔ تین سے زیادہ شخص ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

ایک: ہمیں اس کا پتہ نہ تھا۔

راجہ: خیر، ہمیں بھی یہ کہانی سناؤ جو تم ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔ ہمیں بھی کہانی سننے کا بڑا شوق ہے۔ جب سے ہماری نانی مری ہیں، ہمیں کوئی کہانی سنانے والا نہیں۔ کیا تم ہمیں کہانی سناؤ گے؟

دوسرا: پریوں کی کہانی نہیں۔ یہ مشینی دور کے انسانوں کی کہانی ہے۔ حقیقی کہانی، کیا آپ یہ سننا گوارا کریں گے؟

راجہ: حقیقی کہانی؟ کہانی سے حقیقت کا کیا تعلق؟ کہانی کہانی ہے کیوں میرے وزیر؟

وزیر: نہیں مہاراج۔ اب کہانی کا لہجہ بدل رہا ہے۔ اب ان میں پری، بہشت، دودھ کی ندیوں کا ذکر نہیں۔ اب ان میں مزدوروں، کسانوں کے بہتے ہوئے پسینے کی بو ہے۔ ان کے کرب اور دکھ کی داستان ہے۔

راجہ: (حیرت سے) تمہیں بھی ایسی کہانیاں پسند ہیں؟

وزیر: پسند یا ناپسند سے کچھ نہیں ہوتا مہاراج، یہ وقت کی کہانی ہے۔

راجہ: (ضد کرتے ہوئے) بھئی، ہمیں تو جل پریوں کی کہانی اچھی لگتی ہے۔ اودے بادلوں اور کھلے آسمانوں کی کہانی۔ (درویش سے) کیا تم ایسی کہانی نہیں جانتے؟

ایک: ہم سب وہ کہانی بھول گئے ہیں۔ ہم کل بیٹھے تبصرہ کررہے تھے۔ ایک طرح سے یوں سمجھئے انٹرنیشنل ریلیشنز پر سمینار ہو رہا تھا۔

راجہ: یہ کیا ہوتا ہے؟ میں یہ سب نہیں جاننا چاہتا۔ مجھے کوئی ایسی کہانی سناؤ جسے سن کر نیند آجائے۔

دوسرا: معاف کیجئے گا مہاراج، ہماری کہانیاں سلانے کے لئے نہیں، عوام کو جگانے کے لئے ہیں۔

راجہ: ہم تو جاگے ہوئے ہیں، تم ہمیں کسی طرح جگاؤ گے؟

تیسرا: یہی تو مشکل ہے۔

(اتنے میں ایک سپاہی گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

سپاہی: (ہانپتے ہوئے) مہاراج! خبر آئی ہے کہ پورے صوبے میں قحط اور بھوک مری پھیل گئی ہے۔ لوگ بری طرح مر رہے ہیں اور تقریبا ہزاروں بھوکے ننگے لوگوں کا اژدہام محل کی جانب بڑھ رہا ہے۔

راجہ: (گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے) کیا؟ (پھر بے چینی سے ٹہلنے لگتا ہے، وزیر! آپ ہی کچھ کیجئے۔ اب پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے۔

وزیر: میں، مجھے سوچنے دیجئے۔

راجہ: اور سوچنے کا وقت نہیں۔ اگر کہیں سے غلے کا بندوبست نہیں کیا گیا تو یہ حکومت گئی۔

وزیر: (جھلا کر) آپ کو اپنی حکومت کی پڑی ہے، عوام کا خیال نہیں!

(ایک درباری آگے بڑھ کر کہتا ہے)

درباری: میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔

راجہ: (بے چینی سے) وہ کیا؟ جلدی بکو (پھر سپاہیوں سے درویشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) انہیں قید خانے میں ڈال دو۔

(سپاہی انہیں لے کر چلا جاتا ہے)

درباری: مہاراج میں نے ایک ایسے چراغ کا ذکر سنا ہے، جسے حاصل کرنے سے ہمارے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

راجہ: (حیرت سے) چراغ، کیسا چراغ؟

درباری: وہ چراغ بغداد کے ایک درزی کے لڑکے الہ دین نام کے شخص کے ہاتھ لگا تھا۔ اب وہ چراغ ہندوستان میں ہے۔

راجہ: وہ چراغ ہندوستان میں ہے؟ اس کی خوبی کیا ہے؟

درباری: ایک دیو داس چراغ کا غلام ہے۔ جس شخص کے ہاتھ یہ چراغ لگے گا وہ دیو اس اس کا غلام ہو جائے گا اور پھر جو چیز مانگے گا منٹوں میں حاضر ہو جائے گی۔

راجہ: (آنکھیں چمک اٹھتی ہیں) سچ! اگر ایسا ہو تو کیا ہی اچھا ہو (گرج کر) مگر یاد رکھو، اگر ایسا نہ ہوا تو ہم تمہاری گردن اڑا دیں گے۔

درباری: (سر خم کرتے ہوئے) بے شک مہاراج۔

راجہ: اس چراغ سے ہم شاہی خزانہ بھر سکتے ہیں۔ غلام منگوا سکتے ہیں۔ اُف وزیر جی، آپ کیا کر رہے ہیں؟ جلدی کچھ کیجئے۔ اس چراغ کو ڈھونڈیئے۔ ملک کا کونہ کونہ چھان ماریئے۔ وہ چراغ ملنا چاہئے۔

وزیر : (تشویش سے) مجھے تو سب بکواس لگتی ہے۔ایسے کسی چراغ کا وجود نہیں ہوسکتا۔

درباری : (وثوق کے ساتھ) ہے اور ضرور ہے، آپ کوشش تو کیجئے۔

راجہ : ہاں، یہ اعلان کروادیجئے کہ جس شخص کے پاس یہ چراغ ہو وہ اسے لے کر ہمارے حضور میں فوراً حاضر ہو، انعام ملے گا۔

وزیر: اگر ایسا کوئی چراغ ہے بھی تو کوئی بھلا کیوں دینے لگا۔اور پھر جب اس چراغ سے سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے تو کوئی انعام کی پرواہ کیوں کرے گا؟

راجہ: (سوچ میں پڑ جاتا ہے) ہاں! ٹھیک ہے۔ایسا کرو کہ الہ دین نام کے تمام آدمیوں کو گرفتار کروا کے منگوالو۔

وزیر: گرفتار کرنے سے کیا چراغ مل جائے گا؟

راجہ: بے شک ہم اسے اذیت دیں گے MISA کا خوف دلائیں گے۔

وزیر: مجھے امید نہیں۔ویسے اعلان کئے دیتا ہوں۔(پھر سنتری کو بلا کر کچھ دیتا ہے۔سنتری چلا جاتا ہے)

وقفہ

(کچھ لمحے بعد سپاہی پانچ آدمیوں کو گرفتار کر کے لاتا ہے)

سپاہی: ان پانچوں کا نام الہ دین ہے۔بس اتنے ہی الہ دین مل سکے ہیں۔

راجہ: بے اختیار قہقہہ لگاتے ہوئے) ہاہاہا! تو تم لوگ الہ دین ہو؟ (پھر گرج کر) کہاں ہے وہ چراغ؟

ایک: (تعجب سے) چراغ، کیسا چراغ، مہاراج؟

راجہ: تھپڑ رسید کرتے ہوئے) بدتمیز، جیسے کچھ نہیں جانتا۔ہمیں سب پتہ ہے۔بتاؤ، وہ چراغ کہاں چھپا رکھا ہے؟

دوسرا: یقین کیجئے، ہمارے پاس کوئی چراغ نہیں۔

راجہ: یوں نہیں مانو گے۔سپاہی، اسے دس کوڑے لگاؤ۔

(سپاہی ایک کو کوڑے لگانے لگتا ہے وہ کراہ اٹھتا ہے)

ایک: میں کچھ نہیں جانتا، مجھے چھوڑ دو۔مجھے نہ مارو، میرا نام علاؤالدین ہے۔میں وہ الہ دین نہیں، میں تو علاؤالدین ہوں۔

راجہ: (دانت پیس کر) بتا، چراغ کہاں رکھا ہے؟

(وہ مار کھا کھا کر ادھ مرا ہو کر فرش پر گر پڑتا ہے)

راجہ: جھوٹ بکتا ہے، حرام زادے کمینے، میں ایسی مصیبت میں پڑا ہوں اور تو ڈھٹائی سے جھوٹ بکے جا رہا ہے (دوسرے کو ایک تھپڑ رسید کرتا ہے) کیا تیرے گھر میں کوئی چراغ نہیں؟

دوسرا: (روتے ہوئے) ہے، ہمارے گھر کے طاق پر ایک چراغ دھرا ہے۔

راجہ: (خوش ہوکر) تو پھر جا، جلدی وہ چراغ لا۔

دوسرا: مگر وہ چراغ سونا پڑا ہے۔ اس میں روشنی نہیں۔ جب سے مٹی کا تیل مہنگا ہوا ہے، ہم اپنی کٹیا بھی روشن نہیں کرتے۔

راجہ: (مارتے ہوئے) کمینے، اپنی غریبی دکھا رہا ہے۔ کھال ادھیڑ وادوں گا۔ سپاہی اسے پچاس کوڑے لگاؤ۔

(سپاہی مارنے لگتا ہے، اچانک آواز آتی ہے)

آواز: ٹھہریئے۔

راجہ: کون؟

(سندباد سامنے نظر آتا ہے۔ ایک چراغ اس کے ہاتھ میں ہے)

راجہ: (حیرت سے) سندباد تم؟

سندباد: ہاں میں۔ مصیبت کا ساتھی۔ (چراغ دکھاتے ہوئے، یہی وہ چراغ ہے جس کی آپ کو تلاش ہے۔

راجہ: (خوش ہوکر) ہاں، ہاں، مگر یہ چراغ تمہیں کیسے ملا؟ یہ تو ہمارے ہندوستان میں تھا۔

سندباد: (مسکراتے ہوئے) ہاں، مگر اب یہ ہمارے قبضے میں ہے۔

راجہ: اوہ، تو تمہارے ملک کی خوشحالی کی یہی وجہ ہے؟

سندباد: ہاں، اور اگر اب آپ چاہیں تو ہم آپ کی مدد کے لئے تیار ہیں۔

راجہ: وہ کس طرح؟

سندباد: ہم اس چراغ کے ذریعے ایک بار پھر ہندوستان میں خوشحالی اور کامرانی لا سکتے ہیں۔

راجہ: (بے تابی سے) تو پھر جلدی کرو۔

سندباد: ہم آپ کو غلہ دے سکتے ہیں، کیونکہ آپ کا ملک قحط سے دوچار ہے۔

راجہ: (دیوانوں کی طرح) ہاں، ہاں، مجھے غلہ چاہئے۔

سندباد: (ٹھہرے ہوئے لہجے میں) اور آپ کا شاہی خزانہ بھی خالی ہوگیا ہے؟

راجہ: ہاں تم تو سب جانتے ہو۔

سندباد: (مسکراتے ہوئے) ہم آپ کا شاہی خزانہ دوبارہ بھر سکتے ہیں۔

راجہ: (بے چین ہوکر) تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ جلدی کرو، بھوکے لوگوں کا ہجوم محل کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے۔

(بیک وقت چیخ وپکاراورہجوم کی آواز)

سندباد: مگراس کے لئے آپ کوبھی ہماری کچھ بات ماننی ہوگی۔

راجہ: میں ہر بات ماننے کے لئے تیارہوں، ہرمعاہدہ کرنے کوتیارہوں۔

وزیر: ٹھہریئے مہاراج، اتنی جلد بازی سے کام نہ لیں۔

راجہ: کیا بکتے ہو؟ ایسے آڑے وقت میں میرادوست ملک کام آرہاہےاور میں پس وپیش کروں؟

وزیر: مگر یہ جان لیجئے، اس کی یہ خدمت بےلوث نہیں۔ یہ دیو، اُس چراغ کے دیو سے زیادہ خطرناک ہے۔ پھراگرآپ اس کے چنگل میں پھنس گئےتو رہائی ممکن نہیں۔

راجہ: تم خواہ مخواہ شک کررہے ہو۔

وزیر: شک نہیں، میں یقین کے ساتھ کہہ رہاہوں۔اس کی نیت ٹھیک نہیں۔اس کے چندشرائط ایسے ہوں گےجنہیں مان کرآپ ہندوستان کوان کے ہاتھوں گروی رکھ دیں گے۔

سندباد: اس پاگل کے پاس نہ جائیں۔اس کی بات نہ سنیں۔ یہ آپ کوغلہ نہیں دے سکتا۔

(راجہ وسط میں کھڑا ہے۔ایک طرف سندباد ہے چراغ اٹھائے، دوسری طرف وزیرکا روکتاہواہاتھ۔راجہ پاگلوں کی طرح ایک بارسندبادکو، ایک باروزیرکودیکھتاہے)

وزیر: ہاں، میں غلہ نہیں دے سکتا، مگر میں آہنی ارادے دے سکتا ہوں۔حوصلے دے سکتا ہوں جس سے آپ خودغلہ پیدا کرلیں گے۔آپ کی زمین خودبخود غلہ اگلے گی۔مگراس کے پاس نہ جائیں۔

سندباد: جھوٹ، اس کے کھوکھلے وعدوں میں نہ آئے، غلہ، ڈالر۔

(راجہ دونوں کی طرف بےچینی سے تکتارہتاہے۔وہ کوئی فیصلہ نہیں کرپاتا۔لوگوں کی آوازقریب تر ہوتی جارہی ہے)

(آہستہ آہستہ پردہ گرتاہے)